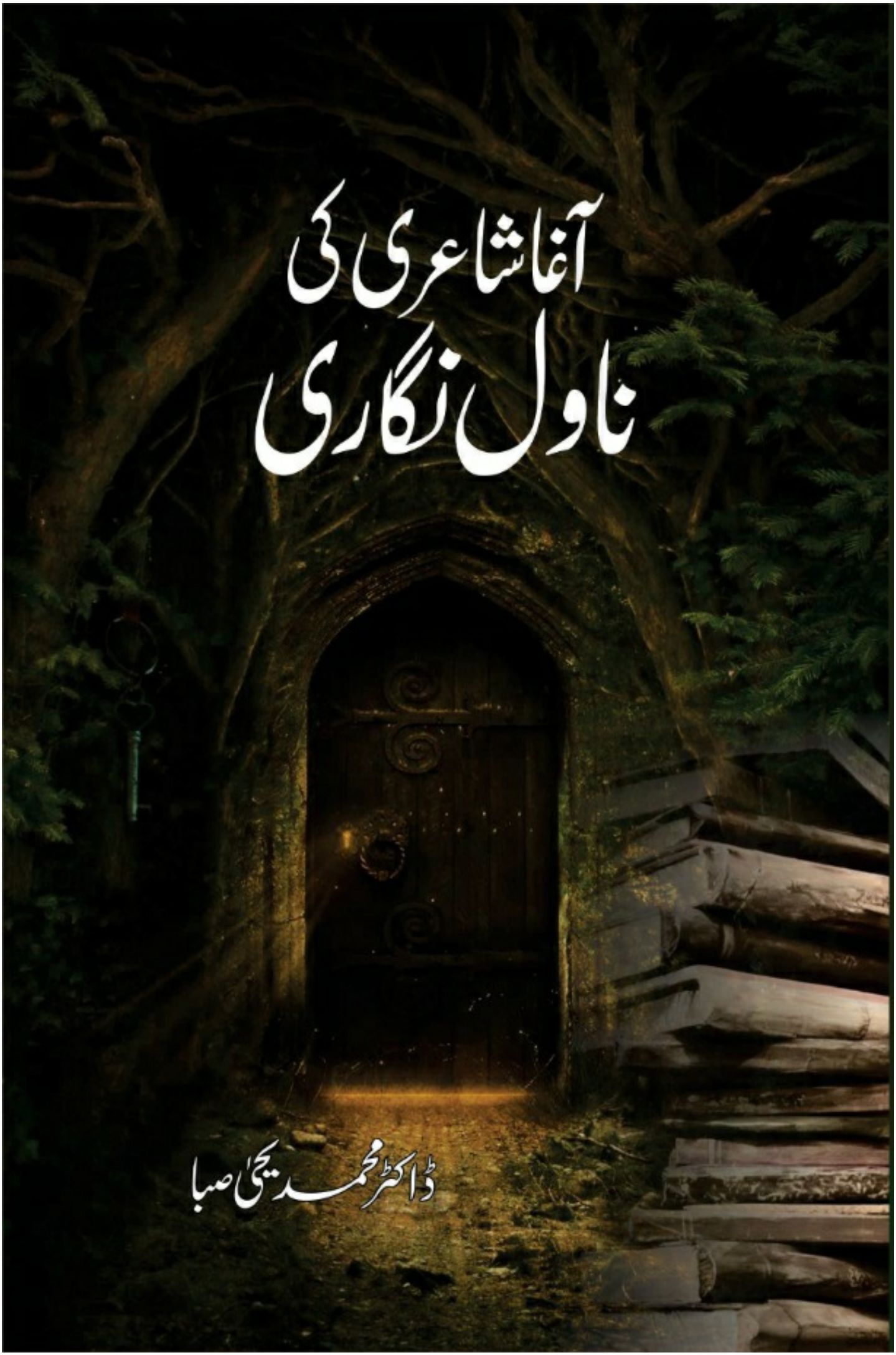
آغا شاعری کی
ناول نگاری
ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

آغا شاعر کی ناول نگاری

ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

آغا شاعر کی ناول نگاری

ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

معاذ پبلیکیشنس
مالیگاؤں (ناسک)- 423203 (انڈیا)

© جملہ حقوق غزالہ شاہین محفوظ

AGHA SHAIR KI NOVEL NIGARI

by :

Dr. Md. Yahya Saba

Year of Edition -2011

ISBN:978-81-930477-1-2

Price Rs. 200/-

نام کتاب	:	آغا شاعر کی ناول نگاری
مصنف/ناشر	:	ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا
سنہ اشاعت	:	۲۰۱۵
صفحات	:	۱۵۰
قیمت	:	۲۰۰
طباعت	:	معاذ پبلیکیشنس، مالیگاؤں (ناسک)

Published By:

MAAZ PUBLICATIONS

H.No.117, S. No.170, Zaitoon Pura,
Malegaon Nasik, Maharashtra, India, 423203

انتساب

والدہ معظّمہ بی بی زیب النسا کے نام
جو جنت نشین ہو کر ہمیں سایۂ عاطفت سے محروم کر گئیں
اور
والد مکرم حاجی محمد انعام الحق کے نام
جو اس دنیا کو ہمارے لیے جنت ارضی بنانے میں منہمک ہیں

فہرست

قلم گوئد	9
آغا شاعر دہلوی اوران کا عہد	15
اردو ناول کا ارتقا	49
آغا شاعر دہلوی کی ناول نگاری	100
کتابیات	143

قلم گوید

دہلی تقریباً ہر عہد میں نہ صرف یا یہ تخت رہی ہے بلکہ عالم میں انتخاب اس شہر بے نظیر کی تاریخ و تہذیب ،علم وفن اور زبان و ادب کو پورے ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل رہا ہے ۔ آزاد ہندوستان کی یہ تاریخی راجدھانی بجا طور پر اردو زبان وادب کی راجدھانی بھی کہی جاسکتی ہے۔اسی کے گردونواح میں کھڑی بولی کی بطن سے زبان دہلوی یا اردو نے جنم لیا جو اپنی دھرتی کی سیاسی ، سماجی ،تہذیبی اور معاشرتی ضرورتوں کے زیر سایہ نشو ونما پا کر اس عظیم تہذیب کی ترجمان بن گئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کے نام سے جانتے ہیں اور یہ ہماری زندہ وتابندہ تاریخی وراثت ہے۔دلّی وہ 'عالم میں انتخاب شہر' ہے جس کے ہر ذرّے میں تاریخ کی داستانیں پنہاں ہیں،چشم بینا کے لیے گنجہائے گرانمایہ یہاں بکھرے پڑے ہیں۔تذکرہ دلّی مرحوم کا اکثر ہوا لیکن دلّی 'مرحوم' کبھی نہیں ہوئی۔ بلکہ یہ شہروں کا شہر وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندہ رہا اور آج بھی تاریخ کا تسلسل برقرار رکھے ہوئے ہے۔یعنی تاریخ اپنے دامن میں سمیٹے وقت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔اس شہر دلّی کی منفرد حیثیت ہے۔یہ روایت اور جدیدت کا سنگم ہے۔ ہمارے زریں ماضی کا امین اور تابناک مستقبل کا ضامن ہے۔ جمنا کے کنارے بسے اس شہر نے وقت کے بدلتے دھارے دیکھے۔ ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں کے دور حکومت دیکھے۔ بادشاہوں نے نام و نمود کے لیے شہر بسائے۔ نیا نگر بسا تو پرانے شہر کی شہری آبادی کا ایک بڑا حصہ وہاں جا بسا۔مگر پرانا شہر پوری طرح اجڑا نہیں۔کسی نہ کسی بستی کے روپ میں زندہ رہا۔تاریخی شواہد ان بستیوں میں آج

بھی سانس لے رہے ہیں۔ان تاریخی یادگاروں کوخطرہ ویرانی سے نہیں بلکہ بڑھتی ہوئی آبادی اور پھیلتے ہوئے شہر سے ہے جوان کونگلتا جارہا ہے۔

انگریزوں نے مغل دربار کے ڈھلتے ہوئے سورج کو دیکھا۔لعل قلعے پر قبضہ کرنے اور تخت شاہی پر بیٹھنے کی تمنا ان کے دل میں جانے کب سے تھی۔ برطانوی سامراج پرستوں کو ہمیشہ اس شہر کی اہمیت کا احساس رہا۔خود شہنشاہ جارج پنجم نے ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو دلّی کے دربار میں ڈرامائی انداز میں دارالخلافہ کلکتہ سے دلّی منتقل کرنے کا اعلان کیا۔

دلّی کے ادبی وتہذیبی منظرنامے پرنظر ڈالتے ہوئے ہمیں اپنی تاریخ کے ان صفحات کو پلٹنا ہوگا، جن میں تہذیب کے آب ورنگ کی تبدیلیوں اور سیاسی اور سماجی دھاروں کے تغیرات کا پتہ چلتا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ سماجی تغیرات کا سب سے اہم نتیجہ سیاسی اور معاشی بنیادوں پر سماج میں زبان کی تبدیلی کے طور پر رونما ہوتا ہے۔ایک قوم جب دوسری قوم سے ہم آہنگ ہوتی ہے تو نشست وبرخاست کے آداب غالب آنے والی قوم کے اثرات کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ زمین وہی رہتی ہے، جغرافیہ بھی وہی ہوتا ہے لیکن تاریخ کی تبدیلیوں سے معاشرت میں تہذیبی ترقیات کے نئے سرچشموں کا بھی پتہ چلتا ہے اور یہ تبدیلیاں روایت کے پس منظر میں نئے انقلابات کی بھی امین ہوتی ہیں۔مغلوب قوم غالب آنے والے سیاسی اور سماجی رویوں کے تحت نئے رنگ وآہنگ کو قبول بھی کرتی ہے اور ان کی توسیع بھی۔دہلی اردو کا وطن اور گہوارہ ہے زبان کا تعلق دل سے ہے اور جس زبان وادب میں ہندوستان کی رنگارنگ تہذیب کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے اس کا تعلق ہندوستان کے دل یعنی دہلی سے ہونا فطری سا ہے۔ دہلی کا تعلق جہاں اردو سے ہے وہیں آغا شاعر قزلباش بھی دہلوی ہیں یعنی یہ کم وبیش دونوں کا وطن ہے۔آغا شاعر کے ذکر سے ادبی تاریخ خالی تو نہیں لیکن ان کی ادبی کاگذاریوں کے تعلق سے جتنا اور جیسا تحقیقی کام منظر عام پر آنا چاہیے تھا نہ آسکا یہ مقالہ اس تلافی کی جانب ایک قدم ہے آغا شاعر قزلباش دہلوی کی شش جہت شخصیت پر کچھ لکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ سورج کو چراغ دکھانا۔

آغا شاعر اردو ناول نگاری کی تاریخ میں بہت زیادہ قابل ذکر تو نہیں رہے مگر اردو ناول کے ارتقاء میں ان کی کوششوں کو اور اردو ادب میں ان کے بعض بے مثل کارناموں کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ادب کی جامع اور مکمل تاریخ کے لیے ضروری ہے کہ صف اول کے ادیبوں کے علاوہ صف دوم کے ادیبوں پر بھی تحقیقی اور تنقیدی کام کیا جائے۔ آغا شاعر کی شخصیت پر اب تک کوئی تحقیقی کام نہیں ہو سکا ہے۔ راقم نے اس احساس کے تحت آغا شاعر دہلوی کی ناول نگاری جیسے موضوع کا انتخاب کیا۔ زیر نظر تحریر میں آغا شاعر کی شخصیت اور ان کے ادبی خدمات کا اجمالاً ذکر کرتے ہوئے ان کے ناولوں پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ اردو زبان و ادب کی تنقیدی تاریخ پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ ہمارے ناقدوں نے گنے چنے مخصوص ادیباء و شعراء کا انتخاب کر لیا ہے اور انہیں پر آنے والے ناقدوں نے بھی اپنا زور قلم صرف کر دیا۔ آغا شاعر قزلباش اس عصبیت کے شکار ہوئے۔ آغا شاعر قزلباش دہلوی کی ادبی شخصیت کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اردو کے مشہور ادیب آغا حشر کاشمیری نے ڈرامے کا فن آغا شاعر قزلباش دہلوی سے سیکھا اور عقیدت کی وجہ سے اپنے نام کے آگے 'آغا' لگایا۔ آغا شاعر قزلباش دہلوی ایرانی نسل کے تھے 1739ء میں ان کے جد اعلی نادر شاہ کی طرف سے محمد شاہ رنگیلا کی حکومت کو اور شکست دینے کے لیے آئے تھے مگر کچھ خاص حالات کے تحت ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا۔ شروع میں مغلیہ حکومت کے دربار سے وابستہ رہے اور بعد میں انگریزی حکومت میں فوجی خدمات انجام دیں۔ مگر ان کے پدر بزگوار نے اس سے انحراف کر کے تعلیم کی طرف توجہ دی اور سرکاری ملازمت کی طرف رخ کیا۔ ان کے والد آغا عبدالعلی بیگ اور سیر ہوتے ہوئے ادب نواز تھے جس کے اثرات نے آغا ظفر علی بیگ کو آغا شاعر قزلباش بنا دیا۔ آغا شاعر قزلباش دہلوی کو اردو فارسی، عربی اور انگریزی پر کامل دستگاہ تھی انہوں نے رباعیات 'عمر خیام' 'قران پاک کا منظوم ترجمہ اور کئی انگریزی ناول کو اردو قالب میں ڈھالا۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا وہ حد درجہ سنجیدہ ذہن رکھتے تھے اور شریف النفس بھی تھے۔ انسان دوستی تو ان کو ورثہ میں ملی تھی۔ خودداری اور انا کا وہ سراپا مجسمہ تھے آغا شاعر قزلباش دہلوی داغ

دہلوی کے شاگرد تھے جس عہد میں ہندوستان میں حالی ، اقبال اور جوش جیسے مردمجاہد میدان مارر ہے تھے اس زمانے میں آغا شاعر قزلباش دہلوی نے ناول ڈرامے، غزل، نظم تخلیق کر کے اپنی ایک منفرد شناخت بنائی۔ آغا شاعر قزلباش دہلوی ایک ہی ساتھ شاعر، محقق، صحافی ، انشاپرداز و ناول نگار تھے۔ انہوں نے قصیدہ، مرثیہ، مثنوی اور رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ۔اردو ناول کے ارتقا کے متعلق یہ امر مسلم ہے کہ اردو ناول کے موجد نذیر احمد ہیں میں نے اردو ناول کی ابتدائی کڑی اٹھارہویں صدی کی داستان 'نوطرز مرصع' 'بیتال پچیسی' 'سنگھاسن بتیسی' 'نورتن' 'سروش سخن' 'گل صنوبر' 'الف لیلیٰ' 'بوستان خیال' طلسم ہوش ربا' 'طلسم حیرت' وغیرہ میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ ان ہی داستانوں اور کہانیوں کے زیر اثر انیسویں صدی میں نذیر احمد کے ہاتھوں اردو ناول کی ابتدا ہوئی جس میں صنعتی انقلاب اور نئی بیداری کو بھی خاص دخل ہے۔ اس طرح نذیر احمد کے بعد جہاں سرشار، شرر، راشد الخیری، منشی سجاد حسین اور محمد علی طیب نے اپنے دلچسپ موضوع کے تحت ناول تخلیق کر کے اس کے ارتقاء میں اہم رول ادا کیا وہیں آغا شاعر قزلباش دہلوی نے اپنے چند ناولوں کے ذریعہ اردو ناول کے ارتقائی کارواں کو آگے بڑھانے میں حصہ لیا اور انہوں نے سب سے پہلے اردو ناول میں تحلیل نفسی کی پیش کش کو بڑی چابک دستی سے قلم بند کیا۔ ناول کے اس ارتقائی سفر میں آغا شاعر قزلباش دہلوی کو بھی ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ اس لحاظ سے وہ صف دوم کے ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولوں سے بیسویں صدی کی ناول نگاری کے ارتقائی سفر کا پتہ ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں بیسویں صدی کے مسلم گھرانوں کی معاشرت کی بھرپور عکاسی کر کے اس عہد کے رسم و رواج اور روایت کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ آغا شاعر کے ناولوں میں بیسویں صدی کا گہرا ثبوت ملتا ہے۔ ان کے ناولوں میں رومانیت 'تحلیل نفسی' اور گاہے گاہے شعور کی رو کا عنصر نمایاں ہے۔ ان کی ناول نگاری بیسویں صدی پر محیط ہے انہوں نے اپنے ناولوں میں بیسویں صدی کی روایت کو ملحوظ رکھا ہے ان کی نثر دلکش ہوتی ہے۔ مرقع کشی اور منظر نگاری ان کے ناولوں کی اہم خصوصیت ہے۔ وہ اپنے ناولوں میں ضروری بیانات اور فطری

مکالمے بہ قدر ضرورت موقع محل کسے اعتبار سے استعمال کرتے ہیں ۔ ان کے ناولوں میں ڈرامائیت کا عنصر بدرجۂ اتم ہے ۔ان کی زبان دہلی کی روزمرہ کی زبان ہے۔آغا شاعر قزلباش دہلوی کے ناولوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے ناولوں میں نفسیاتی پہلو کی پیش کش خاندانی نزاع کے مسائل، متوسط اور اونچے طبقے کا معاشقہ اور ان کی جذباتی زندگی کا عنصر رواں ہے یہی وجہ ہے کہ ان ناولوں کے کردار بڑی انفرادیت رکھتے ہیں۔انہوں نے اپنے مطالعہ ومشاہدہ کے بنیاد پر سماج ومعاشرہ سے متاثر ہوکر اصلاحی نقطۂ نگاہ کے تحت ناول نگاری کی۔ان کے یہاں جنس انسانی نظریات کی بنیاد ہے جو انسان کے فعل کا بھی مرکز ہے۔جنس کا تعلق ڈسپلن سے ہے اردو ناول نگاری سے اس کا رشتہ بڑا گہرا ہے۔آغا شاعر کی ناول نگاری انسانی رومانس اور نفسیات کا پتہ دیتی ہے۔فرائڈ کے تابعین تجزیہ فن میں بھی اس معروضے کو نفس مضمون ثابت کرتے ہیں جسے انسانی زندگی کے لیے Generating Force کہہ سکتے ہیں۔یہی چیزیں انسان کو تخلیق کے علاوہ کشمکش حیات سے بھی وابستہ کرتی ہیں۔تخلیق کا رشتہ انسان سے ہے اور جنس انسانی حیات میں بہت اہم ہے اس طرح ہر تخلیق کے پس پردہ جنس کی کارفرمائی مضمر ہے جو ادب پاروں اور شہ پاروں میں کبھی آسودگی اور کبھی نا آسودگی کی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ازل سے ہر بڑے مفکر کو انسانی زندگی میں جنس کی اہمیت کا اعتراف رہا ہے اور اردو ادب کے علاوہ دنیا کے تمام ادب پاروں میں جنس خاص طور سے متن کا حصہ رہا ہے۔آغا شاعر قزلباش دہلوی اپنے رومانی ناولوں میں جنسی کوائف وعوامل کے اظہار میں دوسرے تمام ناول نگاروں سے مختلف ہیں۔ان کا یہ بغاوت وامتیاز ان کے ذاتی مشاہدہ وتجربات کا ثمرہ ہے۔انہوں نے اپنا نقطۂ نظر جنسی تناظر کی روشنی میں مقرر کیا ہے اور اس کی روشنی میں ناول تخلیق کر کے قوم وملت کی اصلاح کرنے کی کوشش کی۔آغا شاعر کے بعد جن ادیبوں نے اردو میں رومانی ناول لکھے ان میں مرزا سعید نیاز، کشن پرشاد، علی عباس حسینی، مرزا عباس حسین، منشی پریم چند، سجاد ظہیر قاضی عبد الغفار، عظیم بیگ، چغتائی، فیاض علی، عزیز احمد اور کرشن چندر وغیرہ کے نام مشہور ہیں۔ان ادیبوں نے رومانی ناول نگاری کے اعتبار سے آغا شاعر

قزلباش دہلوی کے فن سے کسب فیض کیا ہے ۔آغا شاعر قزلباش دہلوی کے ناولوں میں جہاں رومان رواں دواں ہے وہیں فنی اور تکنیکی اعتبار سے بھی ان کی ناول نگاری اہمیت رکھتی ہے۔

ان مباحث سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اول تو آغا شاعر قزلباش دہلوی کے ناولوں کی تعداد ان کی شاعری کے مقابلے میں کم ہے اس لیے ان کا فن پوری طرح ناولوں میں ابھر کر سامنے نہیں آتا ہے۔ یوں بھی وہ شاعر کا دل و دماغ رکھتے تھے جہاں اختصار سے کام لیا جاتا ہے جبکہ ناول نویس طول بیانی چاہتی ہے۔ پھر یہ کہ ان کے سامنے کوئی بہت بڑا مسئلہ بھی نہ تھا جس کے تحت ناول نگاری کرتے۔ انہوں نے جو ناول لکھے وہ آس پاس کی زندگی کو سامنے رکھ کر لکھے اس لیے ان کی ناولوں کا کوئی بہت بڑا کینوس ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ بڑے چراغ کے سامنے چھوٹے دیئے یوں بھی اپنی روشنی کھو بیٹھتے ہیں۔آغا شاعر قزلباش دہلوی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ان کے معاصرین میں جو لوگ ناول لکھ رہے تھے ان کے حصے میں شہرت زیادہ آئی اور آغا شاعر قزلباش دہلوی کی شاعری کی وجہ سے بھی ناقدین کو ان کی ناول نگاری کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیا لیکن آغا شاعر قزلباش دہلوی کے ناولوں کے مطالعہ سے یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ اردو ناول نگاری کے فروغ میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں اور اردو ناول نگاروں کی پہلی صف میں نہ سہی دوسری صف میں ان کا مقام محفوظ ہے۔

ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

آغا شاعر دہلوی اوران کا عہد

آغا شاعر قزلباش دہلوی کا اصل نام آغا ظفر علی بیگ تھا۔ وہ اصلاً ایرانی النسل کے تھے۔ محمد شاہ رنگیلا کے دور حکومت میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا اور جون 1739ء میں دہلی کو لوٹ کر مال غنیمت کے ساتھ ایران واپس ہو گیا مگر اس کے لشکر میں سے چند لوگ دہلی میں ہی رہ گئے اور ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا۔ انہیں لوگوں میں سے آغا شاعر قزلباش دہلوی کے بزرگ بھی تھے۔ شاعر ان کا تخلص تھا اور ایرانی ہونے کی حیثیت سے قزلباش دہلوی کہلاتے تھے۔ ترکی میں قزل کے معنی سرخ کے ہوتے ہیں اور باش سر کو کہتے ہیں چونکہ ان کے بزرگ سپاہی تھے اور روایت کے مطابق سپاہی سر پر لال ٹوپی پہنتے ہیں اسی لحاظ سے وہ قزلباش کہلاتے تھے۔ رفتہ رفتہ قزلباش کا ایک قبیلہ ہو گیا آغا شاعر قزلباش دہلوی اسی قبیلہ کے ایک فرد آغا عبد علی بیگ قزلباش کے فرزند تھے۔ آغا شاعر کے آبا و اجداد کا پیشہ سپہ گہری تھا شروع میں ان کے بزرگ مغلیہ حکومت کے دربار سے وابستہ رہے اور فوجی خدمات انجام دیتے تھے جب زمانے نے کروٹ لی اور مغلیہ حکومت کا زوال ہو گیا تو انگریز برسر اقتدار ہو گئے نتیجتاً ان کے بزرگوں نے انگریزی فوج ملازمت کر لی یہ سلسلہ ان کے دادا کے زمانے تک چلا مگر ان کے والد آغا عبد علی بیگ نے 'تیر شکستہ نیاں گاں کو قلم میں بدلا۔ انہوں نے رڑکی اسکول سے اوسیری پاس کر کے مستحکم طور پر سرکاری ملازمت کر لی اور دہلی میں کشمیری دروازہ موجودہ کشمیری گیٹ کھڑکی ابراہیم خاں میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آغا شاعر قزلباش کے والد ایک نوکر پیشہ ہونے کی حیثیت سے اس دور کے حالات سے متاثر ہو کر

شعروشاعری بھی کرتے تھے مگران کا کوئی بھی کلام دستیاب نہیں ہے وہ بنیادی طور پر صوفی منش تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے صاحب زادے شعروسخن کی طرف مائل ہوئے۔

آغا شاعر کی پیدائش بروز یکشنبہ 5 مارچ 1871ء میں ان کے آبائی گھر کشمیری دروازہ کھڑکی ابراہم میں ہوئی۔ باپ کے اکلوتے بیٹے ہونے کی حیثیت سے ان کی پرورش و پرداخت مثنوی سحر البیان کے ہیرو بے نظیر کی طرح ہوئی اور ہوتی بھی کیوں نہیں گھر میں خدا کا دیا ہوا بے شمار مال و اسباب تھا ساتھ ہی ان کے والد آغا عبدعلی بیگ قزلباش اعلی عہدے پر فائز تھے۔ ان کی ماں نہایت ہی نیک خداترس، صوم صلوۃ کی پابند پسند اور خوددار خاتون تھیں۔ قدامت پسندی ورثے میں ملی تھی البتہ اس طرح آغا شاعر قزلباش دہلوی بڑے ہی لاڈ و پیار سے پرورش پا کر جب سن شعور میں داخل ہوئے تو ان کے والد نے انہیں اس وقت کے مشہور وممتاز درسگاہ اینگلو عربک اسکول اجمیری گیٹ دہلی میں داخل کرادیا اس وقت کی روایت کے مطابق انہوں نے اردو، فارسی، عربی، انگریزی وغیرہ علوم حاصل کیے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے انگریزی باضابطہ اسکول یا درسگاہ میں نہیں پڑھی بلکہ لگن، مطالعہ، مشاہدہ، کے ذریعہ انگریزی زبان پر عبور حاصل کیا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے شیکسپئر کے بعض ڈراموں کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا ہے۔ جواب تک غیر مطبوعہ ہیں اینگلو عربک اسکول کی تعلیم کے بعد آغا شاعر قزلباش دہلوی کی باقاعدہ تعلیمی زندگی کا سلسلہ مکمل طور پر ختم ہوگیا۔ آغا شاعر قزلباش کا مطالعہ وسیع تھا ساتھ ہی ترجموں اور انگریزی زبان کے مطالعہ کے ذریعہ اپنی استعداد میں اضافہ کرتے رہے۔ ابھی موصوف نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ ماں کی ممتا سے محروم ہوگئے والدہ کا سایہ سر سے اٹھنا تھا کہ دن بہ دن ماں کی فرقت میں افسردہ رہنے لگے۔ ادھر حالات کے پیش نظر ان کے والد نے دوسری شادی کرلی روایت کے مطابق سوتیلی ماں کا نام سن کر آغا شاعر قزلباش دہلوی کا دل کانپ اٹھا ان کے لیے سکون آرام راحت چین اور اطمنان کوسوں دور ہوگیا۔ گھر کی زندگی ان کے لیے زنداں ہوگئی تھی سوتیلی ماں پھر سوتیلی ہوتی ہے یہ اپنی ماں کے آنکھوں کے تارے تھے سوتیلی ماں سے نہیں بنی مہربان باپ کی

ایک نہ چلی چنانچہ ظلم وستم سے تنگ آ کر آغا شاعر ایک دن گھر سے نکل گئے یا یوں کہیے کہ نکال دیے گئے، کئی دن تک بے یارو مددگار بھوکے پیاسے فاقے کی حالت میں شہر کے فٹ پاتھ کا طواف کرتے رہے تین دن حیران و پریشان بھوک سے بے حال نیند سے نڈھال جامع مسجد کے سامنے والے میدان میں حضرت شاہ کلیم اللہ رحمتہ اللہ جہاں آبادی کے مزار پر آرام اور خدا کی مدد کے طلبگار و امیدوار بن کر بیٹھ گئے زمانے کے پیچ وخم سے گھبرا کر زار و قطار رونے لگے تھکے ماندے تو تھے ہی آنکھ لگ گئی سونے کی حالت میں ان کو تازہ کھانے کی خوشبو آئی اور اس کے ساتھ بیدار ہو گئے جاگنے کی حالت میں دیکھا کہ سامنے زردے کی رکابی رکھی ہے چہار طرف سناٹا دور دور تک انسان کا کوئی نام ونشان نہیں تین دن کے فاقے سے تو تھے ہی کھانا دیکھنے کے بعد بھوک کی شدت بڑھنے لگی۔ بسم اللہ کر کے کھانے لگے رکابی کے سارے چاول کھا گئے اور پانی پیا بعد اس کے موزوں شعر کی شکل میں خدا کا شکر ادا کیا گویا کہ آج سے آغا شاعر قزلباش دہلوی کا دل شاعری کی طرف مائل ہوا جس کو علم خداداد کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ح۔1

تعلیم حاصل کرنے کا سلسلہ تو ختم ہو چکا تھا اس کے بعد وہ حضرت کلیم اللہ کے پیروکار ہو گئے۔ دن بھر گھومتے پھرتے تھے مگر رات کو حضرت شاہ کلیم اللہؒ کے مزار پر عبادت و ریاضت میں رات گزارتے تھے اور اس طرح آغا شاعر قزلباش دہلوی زندگی بھر شاہ کلیم اللہ کے عقیدت مند رہے ان کی حیات میں کبھی ان کی پایۂ استقامت کو لغزش نہ نہیں ہوئی۔

جس عہد میں آغا شاعر نے مشق سخن کی ابتدا کی اس وقت ادب میں دو دھارے خاص طور سے نمایاں تھے ایک طرف تو ہندوستان میں داغ کا طوطی بول رہا تھا دوسری طرف حالی، اکبر، چکبست، آتش، ناسخ، امیر مینائی، مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی جوش ملیح آبادی اور جگر مرادآبادی وغیرہ کی نئی نظموں نے دھوم مچا رکھی تھی یہ بیسویں صدی کا زمانہ تھا اس زمانہ کے اکثر شاعر و ادیب ان رجحانات سے اثر قبول کرتے تھے اس زمانے میں 'مخزن' کا اجرا ہوا اس سے نئے رجحانات کو اور تقویت پہنچی۔

آغا صاحب کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز 1890ء یعنی انیسویں صدی کے آخری دہائی سے ہوتا ہے۔ آغا شاعر ماہر فن تھے وہ شاعر، محقق، صحافی، انشا پرداز ناول نگار، ڈرامہ نگار، قصیدہ نگار، مثنوی نگار، غزل گو، رباعی گو اور مضمون نگار تھے ان کا ایک اہم کام قرآن پاک کا منظوم ترجمہ بھی ہے۔ انہوں نے رباعیات عمر خیام کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے وہ بزرگ کامل تھے وہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے ان کی شاعری ہو یا ڈرامہ نگاری، ناول نگاری ہندوستان کے سماجی، سیاسی، اقتصادی مسائل کی تصویر پیش کرتی ہے۔ ان کی شاعری اتحاد باہمی بھائی چارگی، اخوت، محبت، شجاعت اور قومی یکجہتی کا ضامن ہے۔

اس طرح آغا شاعر کی شاعری چاہے وہ نظم ہو یا نثر انیسویں صدی کے اواخر دس سال کی اور بیسویں صدی کی چار دہائی پر محیط ہے۔ آغا شاعر قدامت پسند تھے مگر انہوں نے نئے رجحانات کو بھی قبول کیا اور جب انہوں نے شاعری شروع کی تو بلا شبہ اپنے استاد فصیح الملک بلبل ہند حضرت داغ کی قائم کی ہوئی روایات پر چلنے لگے مگر ان کے دوش بدوش ان کے یہاں بعض ایسے نئے پہلو بھی نمایاں دکھائی دیتے ہیں جن کو نئے عہد کے بدلتے ہوئے حالات اور ان کی وجہ سے پیدا ہونے والے ایک نئے احساس و شعور تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ ان دنوں آغا شاعر کو رہبری کی ضرورت محسوس ہوئی جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے ان کی عمر بارہ سال کی تھی کہ وہ سوتیلی ماں کی وجہ سے گھر سے نکل گئے تھے اور شاہ کلیم اللہ کے مزار میں پناہ گزیں تھے اب ان کا دل شعر و شاعری کی طرف مائل ہوا اور استاد ڈھونڈنے لگے البتہ اس وقت خاندان لوہارو علم و ادب کا گہوارہ تھا اور اس کے بانی نواب الٰہی خاں معروف تھے انہیں کوئی اولاد نہیں تھی مگر ان کے بھائی نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بیٹے نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں تھے وہ نواب الٰہی خاں سے استفادہ کر کے فن شاعری پر کامل دستگاہ حاصل کر چکے تھے ان کے دو بیٹے شہاب الدین احمد خاں ثاقب اور سعید الدین احمد خاں طالب دونوں شاعر تھے ثاقب کے چار بیٹوں میں سے چاروں شاعر ہوئے اور طالب لاولد تھے ہی ثاقب کے بڑے بیٹے شجاع الدین احمد خاں تاباں اور

ان کے چچا طالب اس زمانے کے مشہور و معروف شاعروں اور ادیبوں میں شمار ہوتے تھے۔

خدا کی مدد شامل حال ہوئی آغا شاعر دہلوی کی ان دونوں کے یہاں رسائی ہوگئی تاباں شعر کے فن میں کامل تھے انہوں نے آغا شاعر کی مکمل حمایت اور رہنمائی کی اور رموز شاعری سے آگاہ کرنے کی کوشش میں آغا شاعر نے ایک ہفتہ وار اخبار' آصف الاخبار' جاری کیا جس کا دفتر ان کے آبائی مکان کشمیری دروازہ کھڑکی ابراہیم خاں میں تھا۔ اس کے ذریعہ وہ ادبی مضامین نظم و نثر لکھتے رہے ان کے رنگین شاعرانہ اور پر کیف مضامین کا ایک مجموعہ 'خمارستان' کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس میں 37 مضامین ہیں جو مختلف موضوعات سے متعلق ہیں اس لیے ان سارے مضامین کا مزاج ایک سا نہیں ہے لیکن ایک چیز ضروری ہے جو ہر مضمون میں بے حد نمایاں ہے اور وہ ہے آغا شاعر کی شاعرانہ فطرت جو ان کی نثر میں بھی نمایاں ہے جن میں سے اکثر شائع نہیں ہوئے ہیں۔ آغا صاحب اپنے ڈراموں میں کبھی کبھی خود ہیرو کا رول ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ایک کامیاب ڈرامہ نگار اور ناول نویس تھے ان کے بعض ناول اور ڈرامے ان کی زندگی میں شائع ہو چکے تھے انہوں نے قرآن کریم کا منظوم ترجمہ کر کے کارنمایاں انجام دیا ان کے اس غیر معمولی کام کو اس وقت کے ادیب اور سیاسی رہنما مولانا ابوالکلام ازاد، مولانا اشرف علی تھانوی، خواجہ حسن نظامی بابائے اردو مولوی عبدالحق، شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن، مفتی عبدالقدیر قادری بدایونی مفتی اعظم حیدرآباد دکن، مفتی کفایت اللہ مفتی اعظم ہند وغیر جیسے لوگوں نے سراہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مدتوں کی محنت کے بعد 1922ء میں پہلا پارہ انہوں نے اپنی زندگی میں دہلی سے شائع کیا اس پر اکبر الہ آبادی نے ایک خط میں لکھا تھا۔

حضرت آغا تسلیم !

'اللہ آپ کو جزائے خیر دے آپ نے کلام اللہ کو نظم کر دیا کوئی اللہ کا بندہ اسے طبلہ اور سارنگی پر گا دے تو مزہ آجائے گا' ح۔2

منظوم ترجمہ کا نمونہ ملاحظہ کیے جسے اس میں آغا شاعر نے بسم اللہ اور سورہ فاتحہ کا ترجمہ یوں کیا ہے

'ہے نام سے خدا کے آغاز کا (اجالا) جو مہربان بڑا ہے بے
حد جو رحم والا تعریف اس خدا کی جو رب ہے عالموں کا محشر
کے دن کا مالک روز جزا کا والی تجھکو ہی پوجتے ہیں ہم
تیرے ہیں سوالی سیدھی ڈگر پہ لے چل تابت قدم بنادے
نعمت جنہیں عطا کی ان کی روش سجھادے (ان کی راہ) جن
پر قہر وقضب ہوئے ہیں (نے وہ) کہ جو بھٹک کر گمراہ ہو
گئے ہیں۔'

انہوں نے قرآن کریم کا منظوم ترجمہ کے علاوہ عمر خیام کی رباعی کا مکمل ترجمہ کیا جس میں دوسو ان کی زندگی میں 'خمکدہ خیام' کے نام سے شائع ہوا بقیہ ساڑھے چار سو رباعیوں کا ترجمہ غیر مطبوعہ ہے یہ ترجمہ اردو زبان کے مقتدر ترجموں میں سب سے زیادہ مقبول ترجمہ ہے ان کی اس خدمت کو سراہتے ہوئے عطا اللہ بالوی نے 1837ء میں لکھا تھا۔

'میں بیانگ دہل یہ کہنے کے لیے تیار ہوں عمر خیام کا سب
سے بڑا سب سے بہتر اور اعلی مترجم دہلی کا مایہ' ناز شاعر آغا
شاعر ہے'۔ح۔3

آغا شاعر کی اس خدمت کو سراہتے ہوئے مالک رام نے لکھا ہے کہ!' آغا شاعر دہلوی نواز خاں ناز تالپور کی فرمائشوں پر رباعیات خیام کا منظوم ترجمہ اردو میں کیا جو خمکدہ خیام کے نام سے شائع ہوا۔ح۔4

بیشتر نقادوں کی رائے ہے کہ اردو میں خیام کا اس سے بہتر اور عمدہ ترجمہ کوئی نہیں یہاں نمونہ کے طور پر خیام اور آغا شاعر کے اشعار کو قلم بند کیا جاتا ہے۔

خیام

آمد سحری نداز میخانۂ ما
کائی رند خراباتی دیوانۂ ما

برخیز کہ پرکنیم پیمانہ زمی
زان پیش کہ پرکنندہ پیمانہ ما
گردست دہ، توبہ کنم یزداں را
تو فخر بدین کئی کہ من مے نخوارم
صدکار کئی کہ مے غلام است آن آرا

آغا شاعر

آئی یہ ندا صبح کو میخانے سے
ای رند شراب خوار، دیوانے سے
اٹھ جلد، بھریں شراب سے ساغر ہم
کمبخت! چھلک جائے نہ پیمانے سے
ہم توبہ بھی کرلیں گے مشیت ہے اگر
ہے فخر یہی ناکہ تو میخوار نہیں
سو عیب ہیں اور مے سے بدتر بدتر

عمر خیام

ہرچندکہ رنگ وبوی زیباست مرا
چون لالہ رخ وچو سرو بالاست مرا
معلوم نشد کہ در طربخانۂ خاک
نقاش مناز بہرچہ آراست مرا؟

افسرالشعرا

قدرت نے مجھے حسن دیا تھا کیسا؟
رخ پھول سا، قد سرو سے پیارا بخشا

پر یہ نہ کھلا کہ خاک کرنے کے لیے
نقاش نے پھر مجھ کو سنوارا کیوں تھا؟

عمرخیام

در ہردشتی کہ لالہ زاری بودہ است
آن لالہ زخون شہر یار بودہ است
ہر برگ بنفشہ کز زمین می روید

افسرالشعرا

صحرا میں جہاں لالۂ رنگین ہے کھلا
سلطان کا خون ہے کسی قیصر کا
جو پتی بنفشہ کی زمیں سے پھوٹی
تل ہے جو کسی چاند سے رخسار پہ تھا

عمرخیام

نا کردہ گناہ در جہان کیست بگو؟
آنکس کہ گنہہ نکرو چون زیست بگو؟
من بدکنم وتو بدمکافات کنی
پس فرق میان من وتو چیست بگو؟

افسرالشعرا

نا گردہ گناہ کون دنیا میں ہوا
جس نے نہ کیا پاپ وہ کس طرح جیا
مجھ سے ہو بدی، تو اس کا بدلہ دے برا
مجھ تجھ میں بتا تو سہی پھر فرق ہے کیا؟

عمرخیام

من بندۂ عاصیم رضای تو کجاست
تاریک ولم نورضیاوی تو کجاست
مارا تو بہشت اگر بطا عت بخش
ایں ضرد بود لطف عطائی تو کجاست

افسرالشعرا

پا پی سہی پر تیری رضا ہے وہ کہاں
تاریک ہے دل نور ضیا ہے وہ کہاں
گر مجھ کو بہشت بندگی سے بخشا
اجرت ہوئی یہ لطف وعطا ہے وہ کہاں

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ آغا شاعرفن ترجمہ پر عبور رکھتے تھے۔انہوں نے ایک انگریزی ناول کا ترجمہ اردو میں 'طلسم بدلہ' کے نام سے کیا جو بالاقساط ان کے اخبار' آصف الاخبار' میں چھپتا رہا انہیں دنوں آغا شاعر نے ایک ماہنامہ' گلدستہ' پنجہ نگاریں' کے نام سے اپنی سرپرستی میں نکالا اس ماہنامہ میں اس وقت کے شاعروں اور ادیبوں کا کلام چھپتا تھا۔آغا شاعر کے یہ دونوں خریدے ایک عرصہ تک شائع ہوتے رہے جس کے ذریعہ سے اردو زبان وادب کو حد درجہ فروغ ملا اور ساتھ ہی آغا شاعر کو میدان صحافت میں شہرت حاصل ہوئی۔اس کے علاوہ آغا شاعر نے مترجم کی حیثیت سے شکسپئر کے انگریزی ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کیا جو غیر مطبوعہ ہے۔آغا شاعر قزلباش دہلوی 1871-1940 اپنے عہد کے ادبی منظر نامے میں نامور نثار اور شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔وہ بیک وقت شاعر، ناول نگار، ڈرامہ نگار، مترجم اور کئی رسالوں کے مدیر وصحافی تھے ۔ داغ دہلوی کے مشہور شاگرد جہاں نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی اور منشی وحیدالدین بیخود، دہلوی تھے۔وہیں آغا شاعر نے اپنے استاد داغ دہلوی کی شاعری کو اس درجہ

پھیلایا کہ ان کی شہرت کا آفتاب نصف النہار تک جا پہنچا۔یہی وجہ ہے کہ وہ جانشین داغ افسرالشعراء جہاں استاد جیسے القاب و خطابات سے نوازے گئے۔ انکے انداز بیان کی تشکیل مشاہدے کی قوت احساس کی شدت، جذبے کی جدت اور تخیل کی رفعت کو ان کی شاعری میں بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔'تیر ونشتر' ان کا واحد دستیاب مجموعہ ہے انہوں نے افسانے بھی لکھے ہیں۔ چند افسانے ان کے مجموعے خمارستان میں ملتے ہیں۔ جسے مضامین کا مجموعہ بھی قرار دیا گیا ہے اس میں شامل مندرجہ ذیل افسانے ہیں۔ یادوطن، نیا سال، دامان بہار، جوئی اور بارش کا ننھا قطرۂ، ہندوستانی، بڑھو ورنہ کچل دئے جاوگے، پوشیدہ، ایک قطرہ خون کی سرگذشت، باغ بہشت، حسن اردو کا حجاب، پھول والوں کی سیر، چھوئی موئی، وفائے عہد، کھلتا ہوا پتہ، بجھتا ہوا چراغ، ٹوٹا ہوا ہاتھ، انیس ودبیر، خانہ بدوش، جل ترنگ، چاندنی رات دریائے فرات، رنگیلا جوگی، آہ پنڈت رتن ناتھ سرشار، حضرت داغ کی ایک صحبت، اپنے خالق کو پہچان، میری بادشاہت کا زمانہ، غلام ہندوستان، پہلے کی دلی، جمنا کے کنارے، عبرت ناک مشاہدہ، فیروز شاہ کی لاٹ، ایک البیلی شام، برسات کی بہار، تاجدار دکن کی سوانح عمری، استاد داغ کی اصلاح، ادبی صحبت، میرا گناہ، آغا شاعر کا پیغام۔انہوں ڈرامے بھی لکھے ہیں اور ناول بھی ارمان، ناہید، ہیرے کی کنی اور نقلی تاجدار، ان کے مشہور ناول ہیں ان کے ناول کے بارے میں بھی یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے صرف چار ہی ناول لکھے ہونگے اس لیے کہ 'لیلی دمشق' کو بھی ناول کہا جاتا ہے 'شعلہ جوالہ' ایک ناولٹ اور 'دامن مریم' موصوف کے انشائیوں کا مجموعہ ہے جو ان سے منسوب ہے

موصوف اپنے عہد کی ایسی اہم شخصیت تھے جس کے متعلق مولانا شبلی نعمانی، سیماب اکبر آبادی، سر شیخ عبدالقادر، صفی لکھنوی، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، حامد حسن قادری، سید عابد علی عابد، خواجہ حسن نظامی، عبادت بریلوی، امیر حسن عابدی، مالک رام، مہیشور دیال، وجاہت حبیب اللہ، ویمل جین، عمار رضوی، مہاتما گاندھی، فرمان فتح پوری وغیرہ نے اپنے مضامین میں اپنی قیمتی رائے کا اظہار کیا ہے اور آغا شاعر کے ادبی حیثیت کو متعین کرنے کسی کوشش کی ہے حیرت انگیز

بات یہ ہے کہ ان کی شخصیت اور انکے ادبی کام پر اب تک کسی بھی یونیورسٹی میں کوئی تحقیقی اور تنقیدی کام نہ ہوسکا ہے۔ آغا شاعر دہلوی کی شاعری میں روایت اور تجربے کا نہایت ہی حسین امتزاج ہے جو نواب مرزا داغ کی شاعری کا سرچشمہ اور پیش خیمہ ہے۔ نوح ناروی، سائل دہلوی، بیخود دہلوی کے ساتھ ساتھ اردو شعر گوئی میں موصوف کا اپنا علیحدہ مقام ہے۔

آغا شاعر نے ڈرامے بھی لکھے ہیں موصوف مشہور ڈرامہ نگار آغا حشر کاشمیری کے استاد تھے۔ آغا حشر کاشمیری صحافی بھی تھے وہ 'آصف الاخبار' اور 'پنجۂ نگاریں' رسالے کے مدیر تھے انہوں اس وقت کے سماجی، سیاسی، تاریخی، معاشی، اور ادبی مسائل پر بڑی بے باکی کے ساتھ اداریے لکھے اور اس وقت کے مسائل پر محیط وہ بے شمار مضامین قلم بند کیے ان کی نظر سماج اور سیاست کے ساتھ ادب پر بھی گہری تھی۔ آغا شاعر کی ایک حیثیت مترجم کی بھی ہے انہوں نے قرآن پاک، رباعیات، عمر خیام اور ایک انگریزی ناول کا ترجمہ اردو میں 'طلسم بدلہ' کے نام سے کیا ہے جو اس عہد میں معیاری اور ادبی ترجمہ ہونے کا سند حاصل کر چکے ہیں اور اس وقت بھی مقبول عام ہیں۔

آغا شاعر قزلباش دہلوی آغا حشر کاشمیری کے استاد تھے۔ ڈرامے کا فن آغا حشر نے خاص طور سے آغا شاعر دہلی سے ہی سیکھا ہے۔ اس سے آغا شاعر دہلوی کی ادبی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ آغا حشر کاشمیری جیسے ادیب نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔' ح۔5

یوں آغا شاعر دہلوی کی ادبی زندگی کا کارواں اپنی منزل طے کرتا رہا اس زمانے میں شیخ عبد القادر نے 1901ء میں اردو کا مشہور ماہنامہ 'مخزن' لاہور سے جاری کیا اور آغا شاعر کو لکھنے کے لیے مدعو کیا اس طرح ان کا کلام 'مخزن' کے اس ابتدائی دور میں باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا اس سے بھی آغا شاعر کو شہرت ملی۔ 1901ء میں بھی ان کے کلام کا مختصر مجموعہ 'تیر و نشتر' کے نام سے مخزن پریس لاہور سے شائع ہوا۔ اس زمانے میں منشی غلام محمد نے امرت سر سے ایک ہفتہ وار پرچہ 'وکیل' کے نام سے 1901ء میں جاری کیا۔ ح۔6

اس کے پہلے ایڈیٹر لاہور کے مولوی انشا اللہ خاں تھے دو تین سال کے بعد انشا اللہ خاں نے

ملازمت ترک کر کے اپنا ذاتی پرچہ 'وطن' ہفتہ وار 1903ء میں لاہور سے جاری کیا ۔ح 6

اس کے بعد کچھ دنوں 55 تک 'وکیل' کی ادارت خود غلام محمد کرتے رہے پھر انہوں نے 1904ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کو مدیر کی حیثیت سے کام کرنے کی دعوت دی موالانا آزاد نے اسے منظور کر لیا ادھر غلام محمد نے آغا شاعر کو پرچے کے حصہ نظم کی خدمت سپرد کی مگر یہ کام زیادہ دن تک نہ چل سکا اس لیے کہ مولانا آزاد آزادی کے علمبردار تھے وہ آزادی کا خواب دیکھ رہے تھے اور آغا شاعر داغ کے شاگرد ہونے کی حیثیت سے انا رومانیت کے شکار تھے وہ شوخی اور بانکپن کے سراپا مجسمہ تھے غرض جلد ہی یہ دونوں وکیل سے الگ ہو گئے مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ کی راہ لی اور آغا شاعر دہلوی نے لاہور کا راستہ اختیار کیا۔

لاہور پہنچ کر ان کی ملاقات فتح علی خاں قزلباش سے ہوئی جو بہت ادب نواز تھے مگر ساتھ ہی حاسد بھی تھے کچھ دنوں تک تو آغا شاعر کی انھوں نے بہت ہی خلوص اور محبت سے خدمت کی مگر جب دیکھا کہ ان کی شہرت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے تو فتح علی خاں آغا شاعر سے ناروا سلوک کرنے لگے اس لیے آغا شاعر چند دن بعد شیخ محمد رفیع دہلوی کے ساتھ رہنے لگے محمد رفیع سرکاری ملازمت میں اعلی عہدے پر فائز تھے۔

آغا شاعر نے قیام لاہور کے زمانے میں اپنے بیٹے آفتاب علی قزلباش کے نام پر ماہنامہ 'آفتاب' بھی جاری کیا اس زمانے میں ماہنامہ 'آفتاب' کا لاہور میں کافی شہرہ ہوا۔تقریباً دو تین سال کی مدت میں ہی اس کے بے شمار خریدار ہو گئے تھے۔انہیں دنوں انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس بڑی دھوم دھام سے ہوا کرتے تھے ایک جلسے کے لیے انہوں نے ایک طویل نظم 'یتیموں کی فریاد' لکھی جو انہیں دنوں ایک کتابچے کی شکل میں مرغوب بک ایجنسی لاہور سے شائع ہوئی۔

آغا شاعر دہلوی کی قادرالکلامی کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ جب لاہور میں تھے انجمن کا جلسہ برکت علی میموریل ہال میں ہو رہا تھا شام کا وقت تھا حسب معمول حاضرین میں نامور ادبا و شعراء تشریف فرما تھے ڈپٹی نذیر احمد دہلوی صدرات کا کام انجام دے رہے تھے آغا شاعر اپنی نظم

پڑھ رہے تھے اور مجمع دم بخود ہمہ تن گوش تھا یکا یک بجلی چلی گئی اور ہال تاریک ہو گیا فوراً سر عبد القادر دیا سلائی روشن کر کے آغا شاعر کے دوش بدوش کھڑے ہو گئے تا کہ پڑھنے میں دشواری نہ ہو سر عبد القادر صاحب نے یکے بعد دو تین بار سلائیاں روشن کیں اتنے میں بجلی آ گئی اور سر عبد القادر اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ بجلی گئی اور آئی اس موقع پر نہ تو آغا شاعر نے پڑھنا بند کیا اور نہ ہی سامعین میں سے کسی نے اپنی جگہ سے جنبش کی اس طرح لاہور کے قیام کے زمانے میں آغا شاعر نے بہت بڑے بڑے کارنمایاں انجام دئے مگر تھوڑے ہی دن میں آغا شاعر کا دل لاہور سے اچاٹ ہو گیا اور انہوں نے لاہور کی سکونت ترک کر دی۔

آغا شاعر دہلوی نے لاہور کو خیر باد کہا اور کلکتہ تشریف لے گئے وہاں ان کی ملاقات نصیر الملک شجاعت علی خاں قونصل جنرل ایران سے ہوئی اور آغا شاعر کو ان کی مصاحبت میں رہنے کا موقع ملا اس مدت میں انہوں نے نصیر الملک کے ایماء پر ایک قصیدہ فارسی میں والی ایران مظفر الدین شاہ کی مدح میں لکھا اس پر شاہ موصوف نے خوش ہو کر آغا شاعر کو اختر الشعراء کا خطاب فرمایا اس لیے ان کے احباب ان کے نام کے ساتھ اختر الشعراء لکھتے ہیں۔ انہیں دنوں آغا شاعر کی ملاقات آغا حشر کاشمیری سے ہوئی جو تھیٹر یکل کمپنی چلاتے تھے انہوں نے آغا شاعر کو ڈرامہ لکھنے کی دعوت دی قیام کلکتہ میں انہوں نے بے شمار ڈرامے لکھے جب ڈرامے کے فن پر دستگاہ حاصل کر لی تو آغا شاعر کاشمیری کے کہنے پر وہ بمبئی منتقل ہو گئے۔ وہاں پارسی حضرات نے تھیٹر یکل کمپنیاں قائم کر رکھی تھیں ان کمپنیوں کو آئے دن اسٹیج کرنے کے لیے نئے نئے ڈراموں کی ضرورت ہوتی تھی اس ضرورت کو آغا شاعر نے پورا کیا۔

آغا شاعر کی اس کامیابی پر آغا حشر کاشمیری کو ڈرامہ لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے آغا شاعر سے اصلاح لی اور ڈرامہ نویسی کرنے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ جو کام آغا شاعر نے شروع کیا تھا آغا حشر نے اسے تکمیل کی منزل تک پہنچا دیا اس طرح انہوں نے آغا شاعر کی عقیدت میں اپنے نام کے آگے 'آغا' لگا لیا اور آغا حشر کاشمیری کہلانے لگے حالانکہ اس سے پیشتر وہ محمد شاہ لکھا کرتے

تھے۔آغا شاعر کی ادبی شخصیت اپنے زمانے میں مقبول تھی اس کا پتہ اس زمانے کی تحریروں سے چلتا ہے ان کی شخصیت پر ان کے بعد آنے والے ادباء اور شعراء نے بھی۔تحریری خراج عقید پیش کی ہیں۔ان میں چند ادیبوں کے خیالات ملاحظہ ہوں۔جن سے آغا شاعر کی ادبی شخصیت زیادہ واضح شکل میں سامنے آسکے گی۔

حامد حسن قادری کا خیال ہے کہ!

آپ پلنگڑی پر لیٹے یوں گاؤ تکیہ سے لگے بیٹھے ہیں چاروں طرف۔تلامذہ کا جھرمٹ ہے اور ایک صاحب غزلوں کا تبہ سامنے مسودہ رکھے قلم ہاتھ میں لیے ایک ایک غزل پڑھتے جاتے ہیں۔ حاضرین ہر شعر کو غور سے سماعت فرماتے ہیں اور مناسب موقع پر اپنی اپنی رائے کے لقمے بھی دیئے جاتے ہیں اگر اس مشورے سے استاد کی رائے کو بھی اتفاق ہو گیا تو وہی الفاظ غزل میں بنا دیئے گئے ورنہ جو استاد نے بطور خود املا فرمایا بے ہچک وہ اس مقام پر جڑ دیا گیا اس طرح اصلاح کی اصلاح ہو جاتی تھی اور آپس کے تبادلہ خیالات سے معلومات کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا جاتا تھا۔ح۔6

خواجہ حسن نظامی فرماتے ہیں !

'آغا شاعر قزلباش کا قد درمیانہ تھا جسم دوہرا گداز تھا چہرہ پر گول آنکھیں بڑی بڑی چمکدار اور رسیلی تھیں آواز پاٹ دار تھی جب شعر پڑھتے تھے تو شعر کی تصویر بن جاتے تھے ۔ح۔7

سیماب اکبر آبادی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ !

'برادر مرحوم حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی صرف تخلص کے شاعر نہ تھے بلکہ حقیقی شاعر تھے ان کی شاعری میں زندگی تھی اور وہ شاعری میں زندگی کی ترجمانی کرتے تھے دلی اسکول اور اسالیب داغ کی تبلیغ ونمائندگی آغا صاحب کا حصہ مخصوص تھا ان کی تمام زندگی خدمت ادب میں گزری میں نے انہیں اس وقت دیکھا جب وہ منزل شباب سے گزر چکے تھے لیکن جن لوگوں نے ان کی جوانی دیکھی ہے کہتے ہیں کہ ان کی غزل گوئی اور غزل سرائی دونوں قیامت تھی وہ جب اپنی بلند آواز سے غزل پڑھتے تھے تو مشاعرے کے دور دیوار لرز جاتے تھے اور وہ بقول شخصے لوگوں کے گریبانوں

میں ہاتھ ڈال ڈال کر داد لیتے تھے بلند قامت بھرا ہوا بدن رعب دار چہرہ، بڑی بڑی موچھیں کشادہ دامن اور اپنے قد سے لمبا عصا لیکر جب وہ کسی مشاعرے میں داخل ہوتے تھے تو مشاعرے میں موجود یا معین کی نگاہوں کا مرکز بن جاتے تھے اور آغا صاحب آ گئے آغا صاحب آ گئے کی آوازیں ہر طرف سے بلند ہو جاتی تھیں۔ حیدر آباد دکن کے مشاعروں میں ان کی غزل سرائی آج تک ایک حدیث یادگار ہے۔ ح۔7

علامہ شبلی نعمانی کا خیال ہے !

'آغا شاعر صاحب دلی کے نادر روزگار شاعر ہیں۔ اردو زبان داں ان سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے۔ اس خصوصیت کے علاوہ کہ اردوئے معلیٰ ان کی مادری زبان ہے ان کو لٹریچر اور انشا پرداری کا خاص مذاق ہے۔ ان کی نثر نہایت صاف شستہ اور بے تکلف ہوتی ہے شاعری میں بھی کمال حاصل ہے۔ خیال بندی کے ساتھ بندش کی صفائی اور برجستگی اور روز مرہ محاورات کا نہایت عمدگی سے استعمال ان کے کلام کا خاص جوہر ہے۔ ح۔8

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی رقم طراز ہیں !

شاعر مرحوم تخیل کی تہذیب، الفاظ کی دلاویزی، اسلوب کے اور محاوروں کی صحت میں اپنے استاد کے سچے پیرو تھے۔ شاعر شاعر کا تخیل اونچا تھا ان کی فکر گہری تھی مگر ایسی نہیں کہ انسان کی فہم کو چراغ پا کر دے ان کے بیان میں مٹھاس تھی لیکن گلوسوز نہیں۔ کلاسیکل غزل کی تقریباً تمام ضروریات ان کے اشعار میں موجود تھی انہوں نے نظمیں بھی کہیں ہیں اور اچھی کہی ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس صنف کو انہوں نے اپنے شاگرد رشید مہاراج بہادر برق دہلوی کے سپرد کر دیا تھا اور خود غزل کے احیاء میں مصروف رہے۔ مشاعروں میں پڑھنے کا طور اگر چہ محض تحت اللفظ تھا مگر نہایت موثر لہجہ بہت دلاویز تھا ہاتھ اور تیور سے بھی کام لیتے تھے لیکن صرف اتنا کہ شعر کے موضوع کی رسائی قاری تک ہو جائے اور کتھک کے ہاؤ بھاؤ سے دور رہے میں نے ان کے استاد حضرت داغ کے پڑھنے کا انداز سب سے نرالا اور موثر تھا ان سے بہتر پڑھنے ولا میں نے

نہیں دیکھا بعد کے شعراء میں یہی فیصلہ شاعر مرحوم کے حق میں ہے۔' ح۔9
نیاز فتح پوری نے ان الفاظ میں یاد کیا ہے!

وہ نہ صرف دبستان داغ کے بڑے خوش گو و پر گو شاعر تھے بلکہ اس تہذیب و روایتی زندگی کے بھی بہترین نمائندے تھے جو دلی کی اجڑی ہوئی ثقافت دلی کے مشاعروں دلی کے چاندنی چوک، دلی کی جامع مسجد اور دلی کے اکابر علم و ادب سے مخصوص تھی وہ ایک شاعر تھے اور ان کی زندگی کا وہ حسن تھا جس نے ان کی شاعری کو شہرت دوام عطا کی۔' ح۔10
مجتبیٰ حسین کا خیال ہے !

' آغا شاعر کی پوری شاعری میں خواہ وہ غزل کہہ رہے ہوں یا نظم دو چیزیں بڑی نمایاں ہیں ایک تو یہی سامنے کی چیز ہے جسے ہم زبان کی صفائی کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے ان کی وسیع النظری، زبان کی پختگی اور قادر الکلامی ان کی غزلوں اور نظموں دونوں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔ غزل میں جو زبان شوخ، صاف اور چٹپٹی ہے وہ نظموں میں پہنچ کر ایک نئے انداز سے ابھرتی ہے۔ ان کی غزلوں میں بول چال کا اندازہ جا بجا ملتا ہے وہ مصرعوں میں پختگی اور برجستگی پیدا کرنے کے علاوہ ایک ہی شعر کے کئی رخوں کو وضاحت سے پیش کرتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا پڑھنے والا نہیں دیکھا ایک طوفان کا منظر ایک زلزلے کا عالم ایک بم پھٹنے کی کیفیت مگر بلا کا اثر سن بھی لیں اور سہم بھی جائیں۔ شعر پر جھومنے کو دل چاہے تو بھی دم سادھے بیٹھے رہیں۔ ح۔11
شیش چند طالب دہلوی !

آغا شاعر کی وفات سے گویا ایک نہیں کئی ہستیاں ایک ساتھ اٹھ گئیں قوم کا محترم، قدامت کا مجسمہ دلی کا زبان داں شاعری کا استاد داغ کا جانشین۔ ح۔12
ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا خیال ہے کہ !

' آغا شاعر دہلوی کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ ترجمہ کو بے کیف اور بے جس نہیں ہونے دیتے چنانچہ ان کی اکثر رباعیوں میں کچھ ایسی غزلیت حیات خیزی رومانیت اسلوب کی دلکشی اور فنی پختگی نظر

آتی ہے جو عمر خیام کی رباعیوں کی چغلی نہیں کھاتیں'۔ح۔13

سید وقار عظیم نے لکھا ہے !

' آغا شاعر قزلباش کو اردو والے ایک غزل گو کی حیثیت سے جانتے ہیں جن کی غزلیں رنگین محفلوں کو رنگین بناتی ہیں اور جن کے شعر پڑھکر اب بھی لوگ سر دھنتے ہیں۔'ح۔14

اسی طرح ڈپٹی نذیر احمد دہلوی جو اردو ناول نگاری کے موجد ہیں انہوں نے اپنے عہد میں آصف الاخبار کے حوالے سے آغا شاعر کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ !

'میں بلاخوف تردد کہہ سکتا ہوں کہ اردو کے جتنے اخبار میری نظر سے گزرے اور شاید ہی کوئی ایسا ہو جو میری نظر سے نہ گذرا ہو اس کی سی زبان کے اعتبار سے دہلی اس کو شایان ہے اور یہ تعرض اگر ہے تو اتنا کہ بیان واقعات میں جو شاعری کی جھلک مارتی ہے'۔ح۔15

مذکورہ بالا بیانات اور خیالات سے آغا صاحب کی شخصیت کے جو جوہر سامنے آتے ہیں وہ داغ اسکول کے ممتاز شاعر تھے ان کے کلام کی پہلی اہمیت یہ ہے کہ خود اپنی جگہ مستند اور تیکھا ہے۔ دوسری اہمیت یہ ہے کہ شعری کمالات کی نشاندہی کرتا ہے۔ تیسری اہمیت یہ ہے کہ آغا شاعر کے بعد اور خود ان کے زمانے میں نئے کہنے والوں کے لیے جو زمین ہموار ہو رہی تھی اس کے ہموار کرنے میں آغا شاعر کی محنتوں کو دخل ہے۔ زبان پر ان کی قدرت کسی سے مخفی نہیں بلکہ جتنی ڈرامائیت اور مکالمے کا عنصر ان کے کلام میں ملتا ہے اتنا شاید ہی کسی اور شاعر کے یہاں موجود ہو۔ یہی طرز نگارش ان کے ڈرامے میں ملتا ہے۔

آغا شاعر کے متعلق جیسا کہ مشہور ہے کہ وہ قلندرانہ صفت رکھتے تھے ایک جگہ قید ہو کر نہیں رہنا چاہتے تھے وہ آزاد تھے اور آزادی پسند کرتے تھے اس بات کی تجدید ان کی تخلیقات سے ہوتی ہے خاص طور سے ان کی نظموں نے جو جنگ آزادی کی فضاء پیدا کی ہے مثلاً 'بہار ہندوستان' بھارت دیوی کو پرنام'، 'سرزمین ہند' 'بھارت ماتا کی فریاد' جیسی نظمیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک طویل نظم 'بندے ماترم' کے عنوان سے لکھی تھی جس میں ہندوستانیت کی خوشبو رچی بسی ہیں یا یو کہئے

کہ قومی یکجہتی کا اعلیٰ شاہکار ہے۔

آغا شاعر دہلوی آغا حشر کاشمیری سے جدا ہو کر بمبئی سے حیدر آباد اپنے استاد داغ سے ملنے گئے۔ داغ کا انتقال ہو گیا تھا شاعر کو اس کا بہت صدمہ ہوا ابھی حیدر آباد میں قیام کرتے ہوئے چند روز ہوئے تھے کہ مہاراجا سر کشن پرشاد جو اچھے شاعر تھے انہوں نے اپنی مصاحبت میں جگہ دے دی اور آغا شاعر ان کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ 1911ء میں دلی میں شہنشاہ جارج پنجم کی تاجپوشی کا دربار میں بڑے تزک و احتشام اور اہتمام سے ہوا۔ ایسے موقع سے ملک بھر سے والیان ریاست حاضری دینے کے لیے آئے، مہاراجا سر کشن پرشاد بھی ان کے ہمرکاب تھے آغا صاحب مہاراجا کے ساتھ دہلی آئے اور اپنے والد مرحوم کے ترکے کا تصفیہ کرنے کے لیے چند دن ٹھہرنے کے لیے مہاراجا سر کشن پرشاد سے اجازت لے لی۔ آغا شاعر دہلی میں رک گئے اور اس کے بعد نہیں گئے۔ انہیں دنوں جھالاوار کے مہاراجا سر بھوانی سنگھ دلی تشریف لائے انہوں نے اصرار کر کے ناز برداری کے ساتھ 1919ء میں اپنے ساتھ جھالاوار لے گئے۔

جھالاوار میں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی یہاں پھر آغا شاعر دہلوی نے مہاراجا سر بھوانی سنگھ کی سرپرستی میں آفتاب دوبارہ جاری کیا یہ پرچہ سات برس تک بڑی آن بان اور کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ 1926ء میں مہاراجا سر بھوانی سنگھ کا انتقال ہو گیا حکومت کی بساط الٹ گئی لامحالہ پھر آغا شاعر لاہور پہنچے وہاں پر علمی ادبی حلقے میں لوگ انہیں پہلے ہی سے جانتے تھے اور ان کے شاگردوں کی بھی کمی نہیں تھی ان میں آنند شرر بھی تھے۔ انہوں نے آغا شاعر دہلوی کا تلمند اختیار کیا اور آغا شاعر نے 1927ء کے شروع میں پھر سے 'آفتاب' کا احیا کیا اور اس تیسرے دور میں یہ پرچہ 'آفتاب' کافی دن تک شائع ہوتا رہا اس قیام کے دوران آغا شاعر نے ہمارا آسمان 'بلبلان فارسی' روح نغمہ (غزلیات) 'گل برگ' وغیرہ کتابیں مولانا احسان اللہ خان تاجور نجیب آبادی کے اردو مرکز اور ناشر کتب فیروز سنز کے لیے لکھیں اس کے علاوہ 'آویزۂ گوش' اور 'دامن مریم' بھی آغا صاحب کی اہم تصانیف ہیں۔ دونوں دلچسپ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ ساری کہانیاں انھوں نے

میاں عبدالعزیز صاحب تاجر کتب لاہور کی بے حد فرمائش پر وقتاً فوقتاً طلبات کے اخلاق کی درستی کے لیے لکھی تھیں۔ اس عہد میں یہ ساری کہانیاں اردوئے معلیٰ میں چھپتی رہیں اور پھر بعد میں انہوں نے ترتیب دے کر لاہور سے شائع کیا۔

آغا شاعر قزلباش دہلوی کی ادبی زندگی دو ادوار پر مبنی ہے ان کا ابتدائی دور 1880ء سے 1901ء تک کا ہے اور دوسرا 1901ء سے 1935ء پر محیط ہے اس مدت میں آغا شاعر نے بے شمار کتابیں لکھیں ہیں۔ ان کی بہت ساری مطبوعہ کتابیں نایاب اور غیر مطبوعہ ہیں۔ 'لگونہ' شہادت' (واقعہ کربلا پر ایک نثری تالیف مبلوعہ یوسفی پریس دہلی 1915ء 'لیلی دمشق' شائع کردہ آزاد بک ڈپو لاہور 'انور و رضیہ' ناول شائع کردہ مطبوعہ خادم الاسلام دہلی 'حور جنت' 'ڈرامہ' 'پہلی کرن' 'یادوطن' دربار ہولی' 'سکہ روز' نصف النہار' (لارڈ تاتھ کلف) 'جلترنگ' 'سب میر بن' خدا کے فضل سے دوبارہ زندگی پائی۔ جیسی تحریریں آغا شاعر قزلباش دہلوی کی ادبی شخصیت کو چار چاند لگاتی ہیں۔

تیسری بار بھی آغا شاعر قزلباش دہلوی کو لاہور راس نہیں آیا تو وہ لاہور سے دہلی اپنے آبائی وطن آ گئے اور آخری ایام میں میر علی نواز خاں ناز تالپور والی خیر پور سے رسائی ہوگئی میر صاحب علم دوست اور علم نواز بھی تھے باوجود اس کے کہ ان کی ریاست میں اردو کا چلن برائے نام تھا پھر بھی لکھنؤ، حیدر آباد وغیرہ سے شاعروں اور ادیبوں کو بلا کر اپنا مہمان رکھتے تھے اور شعر و شاعری کی رنگا رنگ محفل کا اہتمام کرتے تھے اس بہانے آغا شاعر بھی بلائے گئے اور میر علی نواز ناز کا دیوان مرتب ہوا جس کی اصلاح آغا شاعر کے ہاتھوں ہوئی حقیقت یہ ہے کہ میر علی خاں نواز ناز نے اپنا دیوان مرتب کرنے لیے آغا شاعر کو اپنا مہمان رکھا۔

آغا شاعر بنیادی طور پر شاعر تھے مگر انہوں نے اردو ادب کی ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ دنیائے شاعری میں ان کا مرتبہ اظہر من الشمس ہے۔ ان کی غزلوں میں روایت رچی ہوئی صورت ملتی ہے اس روایت میں داغ کے اثرات نمایاں ہیں لیکن انہوں نے داغ کی اس روایت کے ساتھ جرأت مومن ناسخ 'ذوق اور میر مینائی کی قائم کی ہوئی روایت کو کچھ اس طرح سے شیر و شکر کیا

ہے کہ ان کی غزلوں میں ان کے مختلف رنگوں سے ایک قوس قزح کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

آغا شاعر نے اپنی غزلوں میں حسن کا بیان بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ عشق کی مختلف منزلوں کی تفصیل و جذیأت بڑے ہی دلکش انداز میں پیش کی ہے اور ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے غزل کے ان دونوں بنیادی موضوعات یعنی حسن و عشق کو انسانی زندگی کی بنیادی سچائی بنا کر پیش کیا ہے اس لیے ان کے معمولی خیالات میں بھی زیادہ گہرائی نظر آتی ہے اور وہ انسانی زندگی کے بنیادی مسائل معلوم ہوتے ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان تمام مسائل کا بیان انہوں نے اپنی تہذیبی روایات کے پس منظر میں کیا ہے اس لیے ان کے خدوخال نہ صرف نمایاں نظر آتے ہیں بلکہ اس میں نسبتاً زیادہ دلکشی کا احساس ہوتا ہے۔ ایک مخصوص معاشرتی فضا اور مخصوص تہذیبی ماحول کے اثرات ان کی غزل میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں ان کی میٹھی اور رسیلی زبان نے بھی ان اثرات کو نمایاں کرنے میں بڑا کام کیا ہے۔ آغا شاعر کی غزلوں کی غالبًا سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جو زبان اس میں استعمال ہوئی ہے وہ صرف زبان ہی نہیں ہے ایک رچی ہوئی تہذیبی روایت کا عکس ہے اور ان کی غزلوں کی ہی خصوصیت انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ چند اشعار ملاحظہ ہو۔

یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ کیوں صورت بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

مجھے یاد ہے میں نہ بھولونگا شاعر
وہ ہنر نہیں کے منہ پھیر لینا کسی کا

انہیں یہ ضد کے پلک پر سے گر پڑے آنسو
مجھے یہ دھیان کہ محنت ہے رائیگا ں کیوں ہو

تم کہاں وصل کہاں ، وصل کی امید کہاں
دل کے بہلانے کو اک بات بنا رکھی ہے

ہے تیری ہی سی شکل مگرشوخیاں نہیں
چپ چپ جب ہی تو ہے تری تصویر کیا کرے
تیز پھر ہوئے جاتے ہی الٹے وہ صداشن کو
نالوں میں خدا جانے یہ بے اثری کیوں ہے
انگار گر یہ پر میرے کس ناز سے کہا
آنسو نہیں تو پوچھتے ہو آستین سے
یہی دن ہیں دعا لیلو کس کے قلب مضطر سے
جوانی آنہیں سکتی میری جان پھر نئے سرسے
میں نے تنہا پا کے جب اس سے کیا اظہار حال
پہلے تو سنتا رہا پھر مسکر ا کر رہ گیا
ذرا نیچے اتر کر بات سن لو
یہ کیا تم آسماں پر میں زمین پر
اک دن برس پڑ وگے ، ہمیں پر ، یہ کھل گیا
کب تک پھر وگے روز میری جان بھرے ہوئے
اے شمع ہم سے سوز محبت کے ضبط سیکھ
کمبخت ایک رات میں ساری پگھل گئی
منتیں کرتی ہے جتون کے منالوں تجھکو
جب میری سامنے روٹھا ہو ا تو آتا ہے
کس کے روکنے سے کب ترا دیوانہ رکتا ہے
بہار آئی چلا میں یہ دھری ہیں بیٹیاں میری
مجھکو آتا ہے تیمّم نہ وضو آتا ہے

سجدہ کر لیتا ہوں جب سامنے تو آتا ہے

ان اشعار کے علاوہ آغا شاعر کے کلام میں ہر جگہ کم وبیش ہیتی خصوصیت نظر آتی ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان کی غزلیں اردو شاعری میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ آغا شاعر نے غزل گوئی کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی لکھیں۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر خاصی تعداد میں ایسی نظمیں لکھیں جن میں جدید شاعری کی اس تحریک کے اثرات نمایاں ہیں جو آغا شاعر کے زمانے میں شباب کی منزلیں طے کر رہی تھی ان نظموں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر خود اس تحریک سے متاثر تھے اور یہ نظمیں ان کے مشاہدات اور احساسات کی صحیح ترجمان اور عکاس ہیں موضوعات کے اعتبار سے ان کی نظموں کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس میں خاصہ تنوع پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی ان کی نظموں کی خصوصیت کے بارے میں ایک موہوم سا اشارہ کیا گیا ہے انہوں نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں تبرکا ان کی نظموں کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

کالی گھٹائیں اٹھیں، وہ بر سا ابر رحمت
ہر شاخ میں شگوفہ کو نپل ہری بھر ی ہے
سبزہ مہک چلا ہے کوئل کی کوک سنکر
قمری کا ہر ترنم پر لطف بانسری ہے
چھم چھم برس رہا ہے شملے میں آج پانی
کشمیر گل فشاں ہے، گل بیز قر مزی ہے
دیکھو سنہری کر نیں اور برف کے نظارے
کس حسن پر ہمالیہ قدرت کا سنتری ہے
مہکے ہوئے خیاباں، نکہت سے یا سمن کی
نرگس کی آنکھ میں بھی شوخی نئی بھری ہے
سورج کسے غوطے کھانا وہ قبلہ رخ شفتہ

دامن میں آسماں کے یہ پھل جھڑی چھٹی ہے

متھرا جی گردارے آ
شام کی نگری میں رم جا
برکھا رت میں گوکل دیکھ
بند رابن کے جنگل دیکھ
یہ وہ دھرتی ہے داتا
جس پر آئے ہیں کنہیا
بہائے وہ صورت وہ تصویر
دل پر مارے سو سو تیر
وہ صندل صندل سی کایا
آنکھوں نے سکھ درشن پایا
ہاتھ میں مرلی دل میں چین
مگن مگن رہنا، دن ، رین

آغا شاعر قزلباش نظم کے ساتھ ساتھ اپنی ادبی زندگی میں نثر کی طرف پر متوجہ ہوئے اور انہوں نے افسانے، کہانیاں، مضامین، ڈرامے، انشائیے اور ناول بھی جانے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آغا شاعر صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک انشا پرداز، صحافی، ناول، نگار، ڈرامہ نویس، قصیدہ نگار اور مثنوی نگار وغیرہ تھے۔ آغا شاعر مرثیہ نگار بھی تھے وہ اپنے مرثیوں میں اظہار مطالب کی ایسی تلمیحات سے کام لیتے ہیں اور ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ ان کے اشعار خود بخود دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوتے چلے جاتے ہیں۔ آغا شاعر نے یوں تو بہت سے قصیدے لکھے مگر تمام قصیدوں میں ان کا ممتاز قصیدہ 'دربار اعظم' ہے جو اس زمانے میں نہایت اہتمام سے یوسفی

پریس دہلی سے شائع ہوا اس میں تقریباً دوسو اشعار ہیں اس کی زمین بہت مشکل ہے زبان کی خوبیاں ویسے ہی اہل دہلی کا حصہ ہیں آغا شاعر اس بارے میں امتیاز خاص رکھتے ہیں پورا قصیدہ تو بہت طویل ہے یہاں گریز کے چند اشعار نمونتاً قلم بند کرتا ہوں ملاحظہ ہو۔

وہ کیا کہنا ترا جان جہاں اندریت
تیری ہی خاک سے چمکے ہیں ہزاروں اختر
آسماں، تیری زمیں کو جو کہیں زیبا ہے
ذرہ ذرہ ہے تری خاک کا مہر انور
تجھ میں وہ لعل چھپے ہیں کہ نہ تھا جن کا نظیر
تجھ میں وہ گہر نایاب کہ قدرت ششدر
دھرم اوتار، مہا بیر رشی اور منی
وہ جواں مرد ، کہہ ، میدان نہ چھوڑیں مر کر
وہ شہنشاہ اولوالعزم، وہ خدا م قریش
وہ شجاں عان عر ب میر عجم ، گردوں فر
جاں نثار ازلی ، پشت و پناہ اسلام
سر فروشان سر انداز و جلالت پیکر
وہ بہادرکہ بگڑ جائیں تو لے لیں اقلیم
بات پر آئیں تو دم بھر میں الٹ دیں لشکر
وہ حسینان جہاں جن کا نہ پر تو دیکھا
مہرگردوں کی نہ پرتی تھیں نگاہیں جن پر
انتخابات زمانہ حکمائے کامل
فضلائے ادب آموزو طریقت گستر

پاک بازاں حقیقت، سخن آرائے مجاز
معدن علم و عمل ، مخزن تفہیم و نظر
تو وہ ہے جس سے ہوہر اک شہر نے رونق پائی
تو وہے لفظ و معانی کا ہے تو ہی ممصدر
تیرے ہی درسے تولے آئے ہیں اردو والے
بات کرنے کی روشن، لطف زباں کے تیور
تو وہ ہے ، تو نے لٹایا ہے چمن کو اپنے
ہند میں چار طرف ہی تری بخشش کے ثمر
برسوں آداب تلفظ کو کیا ہے تعلیم
درس و تدریس سے ہرشخص ہوا بہرہ ور
پھر خدا جانے یہ کیا ہے کہ زمانہ دشمن
افس احسان فراموشی ارباب ہنر
تجھ کو دل بھی کہیں ، تو بھی ہے ام بلاد
ریش باباپئہ بازی ہے تہ زلف مادر
اب کے بھی دور میں تین ہی رہا سر سہرا
تاج پوشی شہ حم جاہ کی ہے پیش نظر
یہ وہ عالم ہے کہ برسوں نہ کوئی بھولے گا
یہ وہ چرچے ہیں ، زبانوں پہ رہیں گے اکثر
گہما گہمی ہے وہ ہر چار طرف نا خدا
لفظ بھی صاف سنائی نہیں دیتے دب کر

اس طرح آغا شاعر نے اپنی زندگی میں لاکھوں شعر کہے مگر افسوس ہے کہ انہوں نے اپنا کوئی

دیوان خاص اہتمام سے شائع نہیں کیا۔ آغا شاعر دہلوی فن شعر گوئی میں داغ دہلوی کے شاگرد خاص اور بہت جدت پسند شاعر تھے۔ ساتھ ہی وہ نثر لکھ کر ناول نگاری کے میدان میں اپنے جوہر دکھائے انہوں نے اپنی زندگی میں بہت سے ناول لکھے۔ مثلاً طلسم بدلہ 'شعلہ جوالا' (ناول) 'قتل نظر' (ڈرامہ) 'نقلی تاجدار' وغیرہ مگر خاص طور سے اردو ادب میں وہ اپنے چار ناولوں کے ذریعہ بحیثیت ناول نگار جانے جاتے ہیں وہ ہے 'ہیرے کی کنی' 'ناہید' 'ارمان' 'نقلی تاجدار' یہ چاروں ناول ان کے طبع زاد ناول ہیں جس میں ہندوستان کے متوسط طبقے کی خانگی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے ان کی تہذیب وتمدن، معاشی، اقتصادی و سیاسی زندگی کی دکھتی رگ کو قلم بند کر کے آپسی اختلاف بغض، کینہ، حسد، نابرابری دور کرنے اور اخوت مروت، مساوات، بھائی چارگی پیدا کرنے کی ترغیب دی ہے۔

جس وقت آغا شاعر دہلوی نے ادبی دنیا میں قدم رکھا ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت تھی ہندوستان کے عام لوگوں کی زندگی دگرگوں تھی انگریزی حاکم ہندوستانیوں کے ساتھ ناشائستہ اور ناروا سلوک کرتے تھے ہندو مسلم کے درمیان نفاق اور اختلاف پیدا کر کے آرام اور سکون سے زندگی بسر کرتے رہتے عام عوام انگریزوں کے شکنجے میں پھنسے ہوئے تھے اور نفرت کی آگ میں جل رہے تھے اس وقت ہندوستان میں سماج کے تین طبقے تھے ایک تو امرا 'وشرفا' یعنی نواب لوگ جو انگریزوں کے فرمانروا تھے دوسرا متوسط طبقہ تھا جس کو خوشی میسر نہیں تھی اور تیسرا طبقہ مزدوروں کا تھا جن کی زندگی دوزخ جیسی تھی ایسے ہی برے وقت میں آغا شاعر نے ناول لکھنا شروع کیا اور اپنے ناولوں کے ذریعہ ہندوستانیوں کے اندر محبت اور انسانیت پیدا کرنے کی کوشش کی اس لیے ان کا ناول رومانی ہوتے ہوئے بھی اصلاحی فلاحی اور قومی یکجہتی کا ضامن ہے۔

بہر کیف اس وقت کے مشہور شعراء مثلاً حالی، اقبال، آزاد، چکبست، مجروح، طالب، ثاقب، راسخ، برتر، ذوق، مومن، غالب، امیر مینائی اور جوش وغیرہ نے ان کی قابلیت کا اعتراف کیا ہے۔ آغا شاعر حیات وشاعری مرتبہ مجتبیٰ حسین خاں بہت ہی اہم تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں ان کی شخصیت

اورفن پر متعدد مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین ان کے رفقا اور ناقدین نے ان کی زندگی ہی میں اور بعض نے بعد از مرگ تحریر کیے جس میں آغا شاعر اردو ادب میں ایک ہفت شخصیت نظر آتے ہیں۔

آغا شاعر بہت ہی سادہ زندگی بسر کرتے تھے انہوں نے اپنی زندگی میں دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی انہوں نے آغا یعقوب دواشی (سابق مدیر ماہنامہ آجکل) کی بہن سے کی تھی ان کے شاگرد جناب دگمبر پرشاد گوہر دہلوی کے مطابق ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی کچھ دنوں بعد ان کی پہلی بیگم عارضہ قلب کی وجہ سے ملک عدم سفر کر گئیں حالانکہ مرحومہ کی زندگی ہی میں آغا شاعر نے دوسری شادی سیتاپور میں سید امیر حیدر کی صاحب زادی سے کر لی تھی۔

ان کے دادا آصف مشہدی اپنے زمانے کے بہت بڑے اور اچھے شعرا میں سے تھے ان کا ذکر 'صبح گلشن' میں آیا ہے۔ ح۔17

بہر حال اس بیگم سے آغا شاعر کو چار اولادیں ہوئیں۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی۔ آغا شاعر کے سب سے بڑے لڑکے کا نام آغا آفتاب علی قزلباش' آغا شیر علی قزلباش اور آغا اقبال علی قزلباش تھا سبھی نے ادبی حلقوں میں اپنا نام پیدا کیا یہ لوگ تقسیم ملک کے بعد دہلی سے پاکستان رخصت ہو گئے۔ آغا شاعر کی سب سے چھوٹی صاحبزادی خدا جانے کیا نام تھا مگر وہ سیماب تخلص کرتی تھیں۔ شاید کہ اب بھی پاکستان میں حیات ہوں۔ انہیں شعر گوئی ورثے میں ملی تھی۔ آغا شاعر دہلوی نے اپنی ستر سالہ عمر میں اردو کی جو خدمت کی وہ بہت کم لوگوں کو میسر ہوتی ہے۔ حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی کا انتقال 12 مارچ 1940ء کو ہوا۔ موصوف کے آخری ایام بہت عسرت اور طویل علالت میں گزرا۔ آغا شاعر دہلوی کا انتقال ظہر اور عصر کے درمیان ان کے آبائی مکان کشمیری دروازہ کھڑکی ابراہیم میں ہوا اور آخری رسوم کی ادائیگی قبرستان علی گنج شاہ مرداں 'صفدر جنگ' میں کی گئی ان کے پختہ مزار پر علامہ اقبال کا یہ مصرع کندہ تھا۔

'آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے'

اور مرحوم کا یہ شعر بھی کندہ تھا ؎

مسکن ہی کوئی قبر سے بہتر نہیں ملتا
آرام کہیں گھر کے برابر نہیں ملتا

مگر تقسیم ہند کے طوفان میں پناہ گزینوں کی آبادی کاری کی وجہ سے مزار شریف کا نام ونشان مٹ گیا۔ آغا صاحب مرحوم نے اپنے ایک شعر میں بے نام ونشان ہونے کی پیشن گوئی بھی اس طرح فرمادی تھی۔

آخر نہ ہوا درجہ شاعر موئی مٹی کا
ٹکرا کے ستمگر نے بے نام و نشان کردی

آغا شاعر کے انتقال پر ملال پر کئی حضرات نے قطعات تاریخ وفات لکھے۔ رضا علی وحشت نے ہجری میں یوں کہا:

جب کہ آغا محترم شاعر
سوئے دارالفنا ہوئے راہی
شعرا میں بپا ہوا ماتم
عام شغل نالہ وزاری
آج دہلی کی اٹھ گئی رونق
محفل شعر ہوئی خالی
فکر تاریخ جب ہوئی وحشت
شاعر 'محتشم' صدا آئی

ح۔19

تلوک چند مرحوم نے لکھا !

بعد ان کے ہوئے بہت سے پیدا شاعر
لیکن نکلا نہ کوئی ان سا شاعر

دہلی میں یاد آئے ہر کو اکثر
فخر دہلی ! جناب آغا شاعر
نظم اور غزل میں بھی جو یکتا شاعر
پیدا ہوتا ہے کوئی ایسا شاعر
قادر تھے نظم اور غزل دونوں پر
دہلی کے شاعروں میں آغا شاعر
انوار ازل کا ہو جو شیدا شاعر
اک معنی روشن ہے سراپا شاعر
ایسے ہی شاعروں میں ہے نام ان کا
دہلی میں ہوئے ہیں وہ جو آغا شاعر

ح۔20

آغا شاعر کی ادبی شخصیت پر محاسے اور مکالمے کا کام ایسا نہیں کہ ان کی زندگی کے ساتھ ختم ہو گیا بلکہ ان کے انتقال کے بعد بھی جہان شعروادب میں دلچسپی رکھنے والے حضرات ان کی شعری اور ادبی خدمات کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیتے رہے ہیں اس کی نمائندہ مثال مجتبیٰ حسین کی مرتب کردہ کتاب بھی ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اس لیے کہ 27 اگست 1983ء کو بمل جین نے آغا شاعر دہلوی کی 43 ویں برسی منانے کے لیے ایک سیمینار کا انعقاد کیا تھا اس موقع سے اردو کے مشہور ناقد گیان چند جین، عارف محمد خاں، بابائے ڈاکٹر عمار رضوی، راؤ برندر اسنگھ، مہیشو ر دیال وغیرہ لوگوں نے اپنے پیغامات بھیجے تھے۔ یہاں صرف گیان چند جین، بابائے قوم مہاتما گاندی جی، عمار رضوی اور مہیشو ر دیال کے خیالات پیش ہیں۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ آغا شاعر قزلباش پر ایک سمینار منعقد کر رہے ہیں۔ میرا ہمیشہ سے عقیدہ رہا ہے کہ بڑے شعرا کے اہم تلامذہ کے کاموں کو ضروری روشنی میں دیکھنا چاہئے۔ آتش،

ناسخ، غالب، میر وداغ کے اہم شاگردوں میں سے محض معدودے چند ہی پر کچھ لکھا گیا ہے۔

میں سیمینار کے لیے مضمون نہیں لکھ سکتا۔ پیغام لکھتے وقت بھی قلم لڑکھڑاتا ہے کیونکہ آغا شاعر کے بارے میں میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا آپ کے تفصیلی مکتوب سے کچھ معلوم ہوا مثلاً یہ کہ آغا حشر ان کے شاگرد تھے اور انہیں کی تقلید میں انہوں نے اپنے نام کے ساتھ آغا کا طرہ لگایا تھا۔ مجھے یہ بھی علم نہ تھا کہ آغا شاعر نے رباعیات عمر خیام یا کلام مجید کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس سیمینار کے طفیل مجھ جیسے ناواقفوں کے علم میں اضافہ ہوگا۔ ح۔21

سیگاؤں وردھا۔11 ستمبر ۳۹ء

پیارے اقبال

مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ آپ کے والد عارضۂ قلب میں مبتلا ہو کر شدید بیمار ہو گئے ہیں

میری دعا ہے کہ خدا انھیں جلد صحت یاب کر دے

ایم۔کے۔گاندھی

(ایک خط)

خیرت طلبی

اظہار تعزیت

سیگاؤں وردھا۔9 مئی ۴۰ء

پیارے اقبال

مجھے آپ کے محترم والد آغا شاعر دہلوی کی وفات کی رنجیدہ اطلاع مل گئی تھی مگر تمہارا پتہ نہیں معلوم تھا۔ میں سوچتا رہا کہ تم لوگوں کو اپنی تعزیت کس طرح بھیجوں، اس کا موقع مجھے اب مل گیا اور میں پورے خاندان کو تعزیت بھیج رہا ہوں۔

تمہارا مخلص

ایم۔کے۔گاندھی

ح-22

ڈاکٹر عمار رضوی

وزیر تعمیرات عامہ۔قومی یکجہتی و پارلیمانی امور

پیغام

مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ نامور شاعر آغا شاعر قزلباش دہلوی مرحوم کی یاد میں ان کی ۴۳ ویں برسی کے موقع پر غالب اکادمی نئی دہلی کے زیر اہتمام ایک سمینار منعقد کیا جا رہا ہے اور اس موقع پر ایک سوڈیز بھی شائع کیا جا رہا ہے۔

قزلباش دہلوی مرحوم داغ کے ایک ممتاز شاگرد اور قادرالکلام شاعر تھے۔ان کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ڈرامہ نویس آغا حشر کاشمیری کے استاد تھے۔

میں اس موقع پر شائع ہونے والے سوینر کی کامیابی کے لیے اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

(عمار رضوی)

ودھان بھون لکھنؤ

مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۸۳ء۔ح۔23

جناب بمل جین صاحب تسلیم

آپ کا خط ملا، آغا شاعر قزلباش دہلوی کی شان میں جتنا بھی کہا جائے کم ہے۔سوینر کے لیے پیغام بھیج رہا ہوں۔

نیازمند

مہیشور دیال

پیغام

مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ جناب آغا شاعر قزلباش کی یاد میں ۲۷ اگست ۱۹۸۳ء کو غالب

اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں ایک سمینار کا انعقاد ہو رہا ہے۔

آغا ظفر علی بیگ قزلباش شاعر ایک کامل فن استاد اور مشاق سخنور تھے، ایک تو دہلوی ہونا ہی زبان کے معاملے میں کافی سے زیادہ سند رکھتا ہے۔اس پر انھیں جناب داغ سا فصیح البیان استاد ملا ، یہی وجہ ہے کہ شاعر صاحب کا کلام زبان و بیان کی خصوصیات سے مالا مال ہے، آغا صاحب دیوان 'تیر و نشتر' کے علاوہ بھی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔آپ کے لکھے ہوئے ڈرامے بھی بہت مقبول ہیں۔

میں منتظمین سمینار، اس میں شرکت کرنے والے ادیبوں کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور سمینار کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔

مہیشور دیال۔ح24

پچھلے دنوں دہلی اردو اکادمی نے بھی آغا شاعر کے حوالے سے ایک سمینار کا اہتمام کیا تھا جو آغا شاعر قزلباش کی تفہیم کے سلسلے کی ایک کڑی کہا جا سکتا ہے۔جوش ملیح آبادی کے اس اقتباس کے ساتھ اپنی گفتگو ختم کرنے کی اجازت چاہونگا۔

'آغا صاحب کے زبان میں وہ شیرینی ہے جیسے لعل و نگار وہ لوچ ہے جیسے شاخ گل اور وہ روانی ہے جیسے آب رکنا باد۔'ح۔25

جس شاعر کو جوش نے ان الفاظ میں یاد کیا ہو یا جس شاعر و ادیب کی تخلیقات میں شیرینی لوچ اور روانی ہو بھلا جہاں ادب میں اس کی شہرت عام اور بقائے دوام سے کون انکار کر سکتا ہے۔

حوالے:

1۔سونیر،صفحہ 14 آغا شاعر میموریل سوسائٹی دہلی۔1983ء

2۔حمکدہ خیام صفحہ 8/9 کتب پرنٹرز اینڈ پبلیشرز لمیٹیڈ کراچی1976ء

3۔سونیر،صفحہ 12 آغا شاعر میموریل سوسائٹی دہلی۔1983ء

4۔سونیر۔صفحہ 10 آغا شاعر میموریل سوسائٹی دہلی۔1983ء

5۔سونیر،صفحہ 10 آغا شاعر میموریل سوسائٹی دہلی۔1983ء

6۔منقول از رسالہ 'نقد ونظر' آگرہ1942ء

7۔منقول از رسالہ 'منادی' دہلی1942ء

8۔منقول از رسالہ 'چمنستان' دہلی1941ء

9۔آغا شاعر حیات وشاعری۔مرتبہ مجتبیٰ حسین خاں صفحہ 151ء

10۔منقول از رسالہ 'چمنستان' دہلی1940ء

11۔آغا شاعر حیات وشاعری صفحہ 295

12۔منقول از رسالہ 'سیب' کراچی مئی1964ء

13۔آغا شاعر حیات وشاعری صفحہ 152

14۔آغا شاعر حیات وشاعری صفحہ 155

15۔حیات وشاعری مرتبہ مجتبیٰ حسین خان صفحہ 240

16۔منقول از رسالہ آج کل مارچ1947ء

17۔حیات وشاعری مجتبیٰ حسین خاں صفحہ 293

18۔صبح گلشن صفحہ 419 مطبوعہ شاہجہانی بھوپال15-12 ہجری

19۔از رسالہ انجام کراچی13 مارچ1964ء

20۔منقول از رسالہ چمنستان دہلی1941ء

21۔منقول از رسالہ 'شعلہ و شبنم' دہلی 1952ء

22۔سونیر 1983ء صفحہ 16 آغا شاعر میموریل سوسائٹی دہلی

23۔انگریزی خط سے ترجمہ منقول از شعلہ شبنم 1953ء

24۔سونیر، گوہر دہلوی۔ 27 اگست 1983ء

25۔سونیر، گوہر دہلوی۔ 27 اگست 1983ء

26۔منقول از رسالہ چمنستان دہلی مارچ 1946ء

اردو ناول کا ارتقا

اردو ادب ہر دور میں نشیب و فراز سے گزرتا رہا ہے۔ لیکن ہر دور میں شاعروں اور دیبوں نے اس کے لیے نت نئی راہیں ہموار کی ہیں۔ شاعروں اور ادیبوں نے اپنی ان تھک کاوشوں سے اردو ادب کو مختلف اصناف سے آراستہ کیا۔ اردو ادب میں ناول کی صنف بھی ان ہی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ناول اطالوی زبان کے لفظ Novella سے نکلا ہے۔ مختلف ناقدین نے ناول کی تعریف مختلف انداز میں کی ہے۔

رابن سن کروسو کے غیر فانی مصنف ڈینیل ڈنو نے اس فن کی بنیاد ڈالتے ہوئے دو چیزوں کا خاص طور سے لحاظ کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ قصیدہ گو کو حقیقت نگار ہونا چاہیے۔ دوسرا یہ کہ اس سے کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق دینا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر قصہ حقیقت پر مبنی نہ ہوگا تو جھوٹا ہوگا۔ اور اپنی تصنیف کے ذریعے مصنف جھوٹ بولنے کا عادی ہو جائے گا۔ وہ کہتا ہے کہ:

'قصہ بنا کر پیش کرنا بہت ہی بڑا جرم ہے۔ یہ اس طرح کی
دروغ پر مبنی ہے۔ جو دل میں ایک بہت بڑا سراخ کر دیتی
ہے جس کے ذریعے جھوٹ آہستہ آہستہ داخل ہو کر ایک
عادت کی صورت اختیار کر لیتا ہے'

فیلڈنگ جو انگریزی ناول کے عناصر اربعہ میں سے ہیں اس فن کی تعریف میں یوں رقم طراز ہیں۔

'ناول نثر میں ایک طربیہ کہانی ہے۔'

یعنی اس کے نزدیک المیہ کہانی ہول کے موضوع سے باہر ہے وہ اس طرح رچرڈسن کے اس نقطہ نظر کو رد کرتا ہے کہ کہانی کی غرض نیکی اور اخلاق کا سدھارنا ہے۔ فیلڈنگ اسے ہنسنے اور ہنسانے کا ذریعہ سمجھتا ہے اس لیے وہ اس میں طربیہ کی شرط لگا دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعریف بھی نامکمل ہے۔ اس کا ایک ہم عصر سمولٹ اس نئے فن کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

'ناول ایک پھیلی ہوئی بڑی تصویر ہے جس میں ایک مقررہ
پلاٹ کو واضح کرنے کے لیے زندگی کے کردار مختلف
جماعتوں کے ساتھ رکھ کر مختلف پہلوؤں سے دکھائے
جاتے ہیں'

یہ تعریف بھی نا کافی ہے اس لیے کہ اس میں سارا زور پلاٹ پر ہے یہ کردار کو واضح کرنے کے لیے پلاٹ نہیں بناتے ہیں بلکہ پلاٹ کو واضح کرنے کے لیے کردار۔ چنانچہ انگلستان کی ایک ادیبہ کلارا ایوز اس فن کی یوں تعریف کرتی ہیں۔

'ناول اس زمانے کی زندگی اور معاشرے کی سچی تصویر ہے
جس زمانے میں وہ لکھا جائے۔'

پروفیسر بیکر نے ناول کے لیے چار شرطیں لازم کر دیں۔ قصہ ہو، نثر میں ہو، زندگی کی تصویر ہو اور اس میں رابطہ و یک رنگی ہو۔ یعنی یہ قصہ صرف نثر میں لکھا نہ گیا ہو بلکہ حقیقت پر مبنی ہو اور کسی خاص مقصد یا نقطہ نظر کو بھی پیش کرتا ہو۔ دراصل ناول وہ صنف ہے جس میں حقیقی زندگی کی گونا گوں جزیات کو کبھی اسرار کے قالب میں کبھی تاریخ کے قالب میں کبھی رزم کے قالب میں کبھی سیاحت یا پھر نفسیات کے قالب میں ڈھالا جاتا رہا۔ لیکن ان تمام شکلوں میں جو چیزیں مشترک تھیں وہ قصہ، پلاٹ کردار، مکالمہ، مناظر فطرت، زمان و مکاں نظریۂ حیات اور اسلوب بیان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

اردو میں ناول کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہ صنف، ادب برائے زندگی کی ترجمانی کرتی

ہے۔ناول نویس اپنی خواہش کے مطابق کوئی نئی دنیا نہیں بناتا، وہ ہماری ہی دنیا سے بحث کرتا ہے ۔جس میں دکھ ہو سکھ ہو، جنگ بھی ہو، صلح بھی ہو اور پیدائش بھی، زمیندار بھی ہو اور مزدور بھی، بادشاہ بھی ہو اور غلام بھی۔ناول نگار صرف تخیل میں پرواز نہیں کرتا ہے۔اس کے قصے کی بنیاد روز مرہ کی زندگی ہوتی ہے۔بیسویں صدی میں جو ناول تخلیق ہوئے ان ناولوں کو تخلیق کرنے کے پیچھے بہت سے عوامل کا حصہ رہا ہے۔

قصہ اور کہانی کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسان کی تاریخ۔اپنی موجودہ شکل میں گو کہانی مغرب کی دین ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ قصہ یا حکایت کے روپ میں یہ قدیم شاعری میں بھی موجود تھی اور عوام الناس میں مقبول بھی۔یہ وہ سچائیاں ہیں جن کے ماننے یا نہ ماننے سے ان کی اصلیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

جس طرح بولنا، سننا سمجھنا محسوس کرنا بشر کی جبلت میں ہے اس طرح کہانی بھی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔زمانہ قدیم میں جب انسان جنگل اور پہاڑوں کا باسی تھا اس وقت ان کا نہ کوئی کنبہ تھا نہ قبیلہ اور نہ انہیں تہذیب، معاشرے یا سیاست سے کوئی مطلب تھا۔دن گذرتا گیا عہد بہ عہد حضرت انسان ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا۔جنگلوں اور پہاڑوں سے نکل کر چند افراد خاندان اور قبیلہ کی شکل میں سماجی طور پر زندگی بسر کرنے لگے۔اپنی ضروریات کے پیش نظر ایک دوسرے کے قریب ہونے اور ایک دوسرے کے درد وغم اور خوشی میں شریک ہونے لگے۔انسانی زندگی کا معیار اونچا ہونے لگا سماج میں تہذیب وتمدن تعلیم وتربیت کا بھی فروغ ہوا۔انہیں دنوں تھکے ماندے یہ انسان اپنے وقت کو آرام وراحت کے ساتھ گذارانے کے لیے موقع بہ موقع ایک ساتھ چند افراد مل بیٹھ کر مافوق الفطری عناصر پر مبنی بات چیت کرتے تھے جو کہانی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔جو عشقیہ اور تمثیلی رنگ لیے ہوئے مافوق الفطری عناصر پر مبنی ہوتی تھی جس کا مقصد آرام، چین، سیر وتفریح تھا مگر جب زینہ بہ زینہ انسان تہذیب یافتہ اور تعلیم یافتہ ہوتا گیا تو اس کے سوچنے سمجھنے اور زندگی گزارنے کا معیار بھی بدلتا گیا ایسی صورت میں مافوق الفطری عناصر

سے مبرّا خاص تمثیلی پیرائے میں کہانی اور داستانیں لکھیں جس کا مقصد انسانی زندگی کی اصلاح تھی ان کہانیوں اور داستانوں میں پند ونصیحت کا پرتو نمایاں ہوتا تھا۔ مثلاً ملا وجہی کی 'سب رس' اس نوعیت کی چیز ہے۔ یہیں سے انسانی زندگی اور ادب میں رومان خاص طور سے جگہ لے لیتی ہے اور داستانی کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔

داستان اور کہانی کا انسانی زندگی سے چولی دامن کا رشتہ ہے جہاں انسان کہانی یا داستان لکھتا بھی ہے اور سنا تا بھی ہے۔ کہانی یا داستان انسان کا وہ کارنمایاں ہے جس میں انھوں نے اپنی زندگی کو مثالی بنا کر تہذیب کی چوٹی پر پہنچایا ہے اس وقت کی داستانوں میں تخیلی تصور مافوق الفطری اور رومانی عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان دنوں انسان چھوٹی چھوٹی کہانی کے بجائے فرصت کے پیش نظر بڑی بڑی داستانیں سننے سنانے بھی لگے۔

اردو ادب میں با قاعدہ داستانوں کا آغاز اٹھارویں صدی کے آخر میں تحسین کی 'نو طرز مرصع' سے ہوتا ہے۔ انیسویں صدی عیسوی میں میر عطا حسین تحسین کی 'نوطرز مرصع' میر امن کی باغ و بہار اور انشاء کی 'رانی کیتکی کی کہانی' کی داستانوں کو چھوڑ کر میر امن کی باغ و بہار' حیدر بخش حیدری' آرائش محفل' طوطا کہانی' خلیل علی خاں اشک کی 'داستان امیر حمزہ' بہار علی حسینی کی 'نثر بے نظیر' مظہر علی ولا اور للولال کی 'بیتال پچیسی' کاظم علی جوان اور للولال کو کی 'سنگھاسن بتیسی' جیسی داستانیں فورٹ ولیم کالج کے تحت تصنیف ہوئیں اور اس کے بعد محمد بخش مہجوری کی 'نورتن' سرور کی 'فسانہ عجائب' نیم چند کھتری کی 'گل صنوبر' الف لیلیٰ' 'بوستان خیال' طلسم ہوش ربا' سخن دہلوی کی 'سروش سخن' شیون کی 'طلسم حیرت' اور الف لیلیٰ' وغیرہ جیسی مختلف چھوٹی بڑی اور درمیانی داستانیں مخطوطہ و مطبوعہ انیسویں صدی کی آخر تک لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ اس وقت کی داستانیں منطق اور انسانی زندگی کے فلسفہ سے مبرا ان کی دل لگی اور دلچسپی کے وسائل اور اصلاح کے ذرائع فرہم کرنے پر مشتمل ہوتی تھیں ان داستانوں کی ضخامت کا انحصار داستان گویوں پر تھا۔ لوگوں کی فرصت کو گومد نظر رکھتے ہوئے داستان گو داستان لکھتے تھے۔

صنعتی انقلاب کے بعد بدلتے ہوئے حالات میں ہندوستانی تاریخ نے کروٹ لی انسان نے اپنی زندگی گزارنے کے طریقے بدلے عام لوگوں میں نئی بیداری آئی اور قدیم رسم و رواج سے انحراف کر کے مغربی طرز معاشرت کے مطابق زندگی گزاری جانے لگی۔ نئی ذہنی اور ادبی فضاء سازگار ہوئی تو جدید تقاضوں نے پرانی روایت کو مسمار کر دیا اور نئی سماجی طاقتیں اور نقطہ نگاہ نمودار ہوئے اور اس کے زیر اثر افسانوی ادب میں صداقت پر مبنی اور اصلاح کی غرض سے ناول لکھے جانے لگے۔

جب ہم اردو ناول کے ارتقائی سفر کا جائزہ اور ابتداء کے متعلق غور کرتے ہیں تو سب سے پہلی نظر نذیر احمد کے ناولوں پر پڑتی ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں بچوں اور عورتوں کی تعلیم کے ذریعہ مسلم سماج کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جنہیں کچھ نقادوں نے جدید ناول کے مطالبات کو پورا نہیں کرنے کی وجہ سے ناول کہنے سے گریز کیا ہے۔ مثلاً ان نقادوں کا کہنا ہے کہ نذیر احمد کے ناولوں کا پلاٹ موضوع اور اس کے مختلف فنی اجزاء ایسے نہیں ہیں جس میں عام انسانی زندگی کا فلسفہ موجود ہو۔ ان کے ناول محض تبلیغی اور پند و نصائح کا رنگ لیے ہوئے ہیں اور یہ سچ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی لڑکیوں کی اصلاح کے لیے ناول لکھے تھے مگر سچ یہ ہے کہ ان کے ناولوں کے کردار میں عام انسانی زندگی کی ٹھوس حقیقتیں نمایاں ہیں۔ ان کے ناولوں کے کردار عام انسانی زندگی سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں اس طرح انھوں نے اپنے ناول نگاری کے ذریعہ نئے اسلوب اور فن کی ایک نئی روش قائم کی ہے یہ اور بات ہے کہ مغرب کے مفہوم کے مطابق ان کے ناول، ناول کے فن پر کھرے نہیں اترتے مگر یہ حقیقت ہے کہ ناول کی داغ بیل انھوں نے 'مرات العروس' 'بنات النعش' 'توبتہ النصوح' 'ابن الوقت' 'فسانہ مبتلا' وغیرہ ناول لکھ کر ڈالی ہے جو ناول کا خشت اول ہے۔

نذیر احمد نے سب سے پہلے 1869ء میں اپنا ناول 'مرات العروس' لکھا اس کے بعد انھوں نے ناول اور اصلاح معاشرت میں چولی دامن کا رشتہ قائم کیا۔ اس میں ان کی منطقی فکر اور اصلاحی

اور تبلیغی مزاج کو خاصہ دخل ہے۔ دھیرے دھیرے زندگی اور فن کا رشتہ وسیع ہوتا رہا اور اسی درمیان مقصد اور فنی احساس کے مابین توازن بھی قائم ہوا جس نے نذیر احمد کے 'فسانہ مبتلا' تک پہنچتے پہنچتے ایسی شکل اختیار کر لی جہاں واعظ اور فنکار یکساں نظر آنے لگے۔

نذیر احمد کے ہم عصر سرشار اردو کے دوسرے ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولوں میں اس عہد کے لکھنؤ کے معاشرت کی تصویر کشی کثرت سے ملتی ہے۔ جنہوں نے انسانی زندگی کے پھیلاو اور ان کی گہرائیوں پر روشنی ڈالی اور اردو ناول کو اس ابتدائی دور میں ایک ایسی روایت سے آشنا کرایا جو فنی لوازمات سے پر ہے۔ انہوں نے لکھنوی معاشرت کو اپنا موضوع بنا کر وہاں کے لوگوں کی اجتماعی زندگی کی اس طرح عکاسی کی کہ سب کو اپنی اصلی شکل نظر آنے لگی۔ سرشار نے پوری طرح لکھنؤ کا مشاہدہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول 'فسانہ آزاد' میں ایک خاص عہد کا لکھنؤ نمایاں ہے۔

فسانہ آزاد کے ذریعہ موضوع سے پوری واقفیت مشاہدے کی گہرائی زندگی کی وسعت اور گہرائی کا احساس اور ایک مخصوص معاشرے کی تہذیب وتمدن اور رسم ورواج کا علم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سرشار نے داستان کی چھوڑی ہوئی روایت کے راستے پر چل کر ہمیں کئی ایسے کرداروں سے آشنا کرایا ہے جو ایک مخصوص مزاج کے مالک خاص طبعیت کے حامل اور مثالی ہیں۔ مثلاً خوجی کا کردار یہ کردار ناول نگاری کے فن کی روایت کا ایک ناقابل فراموش عنصر ہے۔ یہ کردار مستقبل کے ناول نگاروں کو فن کی روشنی بخشتا ہے۔ سرشار نے اپنے ناولوں میں لکھنوی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی مصوری کی ہے اور معاشرے کے مزاج کی عکاسی کرتے ہوئے ایسے کردار کا تعارف کرایا ہے جو انسانی زندگی کا ترجمان ہے۔ یہ سارے کردار وضع قطع کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں مگر سرشار کا کمال یہ ہے کہ ان کے ہم قامت کرداروں کی یکسانی کے باوجود ان میں ہر جگہ ایک انفرادی رنگ عیاں ہے۔ اس طرح ان کے ناولوں کے کردار ن یکسانیت رکھتے ہوئے بھی اپنا ایک خاص رنگ رکھتے ہیں۔

سرشار نے ناول نگاری کے فن اور اس کی روایت کو ایسی تقویت بخشی جو آج بھی ہمارے ادب

میں نمایاں ہے۔سرشار اپنے ناولوں کے کرداروں اور قاری کے باہمی رشتے کی نزاکتوں کو پوری طرح محسوس کرتے ہیں جبکہ نذیر احمد اپنے ناولوں میں قاری کی ذہانت پر یقین نہیں رکھتے ہیں۔ بہر حال اس طرح سرشار نے صنف ناول نگاری کو حد درجہ فروغ دیا جس کی داغ بیل نذیر احمد نے ڈالی تھی۔اس اعتبار سے 'فسانہ آزاد' 'سیر کہسار' اور 'جام سرشار' وغیرہ شہرت یافتہ ناول تخلیق کر کے انہوں نے اردو ناول نگاری کے فن کو وسعت دی۔

اس کے بعد شرر نے اردو میں تاریخی ناول تخلیق کر کے ایک نئی روش کا آغاز کیا اور اپنے ناولوں میں اسلام کے شاندار ماضی کا کثرت سے ذکر کیا اور اس روش کو انھوں نے اپنا نصب العین سمجھا جس طرح نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے ذریعہ مسلمانوں کے متوسط طبقے کی معاشرتی اخلاقی، معاشی مذہبی اصلاح اور مستقبل کو سنوارنے کی کوشش کی، اس طرح شرر نے ماضی کی عظمت کو دہرا کر مسلمانوں کو راہ مستقیم پر چلانے کی کوشش کی اور قومی اتحاد بھائی چارگی اور انسان دوستی کا سبق سکھایا تا کہ مسلمانوں کا مستقبل روشن ہو۔شرر کے دل میں قوم کا درد تھا انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ پورے قوم کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔انھوں نے ناول کو اپنے خیالات اور تصورات یعنی اپنی اصلاحی مقصد کو قوم تک پہنچانے کا ذریعہ بنایا اور ناول کے فن کو اردو میں برتنا شروع کیا جس میں شرر کو اولیت حاصل ہے۔اس کی مثال ان کا ناول 'فردوس بریں' ہے۔ناول کی وہ خوبیاں جو نذیر احمد اور سرشار کے یہاں نہیں ملتی شرر نے ان کی طرف توجہ دی ہے۔

شرر نے اردو میں ناول نگاری کو ایک مسئلہ فن کی طرح برتا اور اپنے ناولوں میں پر تکلف منظر نگاری کی چاشنی اور چٹخارے اور ایک خاص قسم کی انشا پردازی کو اس طرح جگہ دی کہ یہ بھی فن کے اہم جز ہو گئے۔انھوں نے مغربی فن کے مبادیات اور مشرقی مزاج کی شوخی اور رنگینی کے حسین امتزج کو فروغ دیا، جس کی تقلید ان کے بعد آنے والے ناول نگاروں نے بھی کی۔

اردو ناول نگاری میں فنی روایت کی بنیاد نذیر احمد سرشار اور شرر نے ڈالی ان لوگوں نے قصہ گوئی کی دنیا میں ایک نیا راستہ نکالا اور اپنے عمل کے ساتھ اس راستہ کو ہموار کیا جس سے آنے والوں

کے لیے انتہائی آسانی ہوگئی 'مراۃ العروس'، 'بنات النعش'، 'توبتہ النصوح'، 'ابن الوقت'، 'فسانہ مبتلا'، 'فسانہ آزاد' اور 'فردوس بریں' جیسی شاہکار تخلیقات اس کی روشن دلیل ہیں جس سے ہر شخص کو ناول نگاری کی روایت اور اس کے آغاز کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

اس کے بعد ناول نگاری کا ایک ایسا دور آیا جو ابتدائی فنی روایت کی پیروی کا دور کہلاتا ہے جہاں نذیر احمد، سرشار اور شرر کی اولیت کو فوقیت ملی اس دور کے روح رواں راشد الخیری منشی سجاد حسین اور محمد علی طبیب ہیں۔ راشد الخیری نے نذیر احمد کے فن پر مبنی ناول نگاری کی ہے ان کی ناولوں کا پیش خیمہ نذیر کی طرح مسلم معاشرہ کے مسائل کے دل کا منشور ہے۔ دونوں کے ناولوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ نذیر احمد نے عورت کی اصلاح کے لیے ناول لکھا اور راشد الخیری نے اس کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اس کی معاشرتی حیثیت بلند کرنے کی بھی کوشش کی ہے اس طرح راشد الخیری کے ناول نذیر احمد کے مخصوص انداز میں ہیں۔ ان کی ناول نگاری عورت کی مظلومیت کے داستان ہے۔

راشد الخیری اپنے ناولوں کے ذریعہ وہی کام انجام دیتے ہیں جو اکبر الہ آبادی اپنی شاعری کے ذریعہ دیتے ہیں ان کے تمام ناولوں میں گھریلو زندگی محور اور مرکز کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے تعلقات کے تذکرے سے ہمشہ پرہیز کیا۔ جنس و جنسیات ان کے نزدیک ایک عفریت ہے۔ اس کے محض ذکر سے بھی انہیں خوف آتا ہے ان کے ناولوں میں شروع سے آخر تک تصنع کی چھوٹ ہے راشد الخیری کی ناول نگاری کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ تبلیغی انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ انہوں نے ناول نگاری کے میدان میں اپنے قلم کے جوہر دکھلائے اور اپنے ناولوں کی بدولت مصور غم کہلائے۔ ان کے ناولوں کا انجام اکثر و بیشتر حالات میں المناک ہوتا ہے۔ مگر ان کی جزیات نگاری کھوکھلی جذباتیت کا شکار ہے۔ مجموعی اعتبار سے انہوں نے ناول کے فن کو ترقی دینے میں نمایاں حصہ نہیں لیا مگر زبان و بیان کے لحاظ سے ان کے ناول زندہ و جاوید رہیں گے۔ منشی سجاد حسین نے سرشار کے فن پر مبنی ناول نگاری کی جیسا کہ ان کے ناول 'حاجی بغلول' اور 'طرحدار' کے

مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے فسانہ آزاد کی روشنی میں اپنے یہ دونوں ناول تخلیق کیے ہیں۔ ان کے ناول مذہبی اور سیاسی تعصّبات اور ذہنی حد بندیوں سے آزاد ہیں۔اس طرح ناول نگاری کے اس تقلیدی دور میں راشدالخیری اور منشی سجاد حسین نے ایک خاص روش سے متاثر ہو کر اپنا مخصوص رنگ قائم کیا۔جس کی وجہ سے انہیں ناول کی تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے۔

اس کے بعد محمد علی طبیب نے شرر سے حد درجہ متاثر ہو کر ناول لکھے ہیں ان کے ناولوں میں شرر کے فن اور اثرات نمایاں نظر آتے ہیں جس طرح شرر نے مسلمانوں کے کارہائے نمایاں کو یاد دلا کر عہد حاضر کے زوال کے اسباب پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی اس طرح محمد علی طیب نے مسلمانوں کی اصلاح کے لیے پند ونصائح اور لمبی تقریروں پر مشتمل ناول لکھے جس نے ان کے فن کو نقصان بھی پہنچایا ہے۔محمد علی طبیب کے بعد ان دنوں جن لوگوں نے ناول نگاری کے ذریعہ قوم وملت کی اصلاح کی ہے ان میں سجاد حسین کسمنڈوی آغا شاعر، ریاض خیر آبادی، شاد عظیم آبادی، احمد علی شوق اور قاری سرفراز حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔

مجموعی طور پر ان لوگوں کی ناول نگاری نصف بیسویں صدی ہی محیط ہے ان لوگوں نے اپنے ناولوں میں خاص معاشرے کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کر کے ناول نگاری کو اوج ثریا پر پہنچا دیا ہے۔ان لوگوں نے مختلف قسم کے ادبی اور شاعرانہ وسیلوں سے کام لے کر اجتماعی زندگی کے مختلف مسئلوں کے موضوع پر ناول لکھ کر قوم وملت ہے اصلاح کی خدمت انجام دی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نذیر احمد، سرشار، راشدالخیری، محمد علی طبیب، منشی سجاد حسین، آغا شاعر، ریاض خیر آبادی اور قاری سرفراز حسین کے ناولوں میں زندگی کا تنوع پھیلاو اور گہرائی و گیرائی کا عنصر گاہے گاہے ملتا ہے۔ان کے ناول رسوا کی طرح اخلاقی زوال کی فضا میں گہری معنوی تعبیر وتفہیم کے حامل ہیں۔اس کی وجہ یہ رہی ہے کہ ان لوگوں کے ناولوں میں فنی نزاکتوں کی کمی نہیں تو بہتات بھی نہیں ہے مگر ایک بات ضرور ہے کہ ان لوگوں کی تحریریں فنی شعور کی روح رواں ضرور ہیں۔اس کی مثال ہمارے سامنے 'امراؤ جان ادا' 'خواب ہستی' 'ہیرے کی کنی' 'نقلی

تاجدار' 'ناہید' اور 'ارمان' ہے جس کی وجہ سے اردو ناول نگاری میں نفسیاتی اور تجزیاتی ناول کی ابتداء اور شاعرانہ تخیل کا فروغ ہوا۔

آغا شاعر نے اپنے 'ارمان' 'ہیرے کی کنی' اور 'نقلی تاجدار' جیسے اہم ناولوں میں بیسویں صدی کے ناول کے شعور کا گہرا ثبوت دیا ہے۔ یہ ان کے طبع زاد ناول ہیں انہوں نے اپنے ناولوں میں بیسویں صدی کے مسلم گھرانوں کے معاشرت کی بھرپور عکاسی کر کے اس عہد کے رسم ورواج اور روایت کو بروئے کار لائے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں عوام الناس کے نفسیاتی مسائل کو بڑی فنکاری اور چابکدستی سے پیش کرنے کی مساعی جمیلہ کیا ہے۔ پریم چند اس عہد کے ناول نگاروں میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ سدرشن، محمد مہدی تسکین، قاضی عبدالغفار، مجنوں گورکھپوری، نیاز فتحپوری، کشن پرشاد کول، ل احمد وغیرہ نے بھی اپنے ناولوں میں اس عہد کے مسائل کو حالات اور نزاکت کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ عزیز احمد نے ناداری اور شہر میں رہنے والوں کی جنسی رشتوں کو قلم بند کیا ہے۔ ان کی ناول نگاری کے متعلق تنقیدی گفتگو اگلے باب میں ہوگی۔ قاضی عبدالغفار نے ایک ممتاز نثر نگار اور اعلیٰ پائے کے اہل قلم کی حیثیت سے پوری ادبی دنیا سے اپنا لوہا منوایا' لیلی کے خطوط' مجنوں کی ڈائری' عجیب' تین پیسے کی چھوکری' جیسی داستانوی اور افسانوی کتابوں میں رومانی انداز کی نثر کا لطف تو ملتا ہی ہے ساتھ ہی ساتھ ان کتابوں میں طنز کا تیر ونشتر بھی چلایا گیا ہے۔ انہوں نے رومانوی انداز کی ہی نثر نہیں لکھی ہے بلکہ ان کا قلم سنجیدہ عنوانات پر بھی پوری روانی کے ساتھ چلتا ہے۔

فسانہ آزادی کی طرح امراو جان ادا کا پس منظر بھی لکھنو کا زوال آمادہ معاشرہ ہے انہوں نے اپنے عہد کے لکھنؤ معاشرے کی تصویر کشی کی ہے۔ مرزا ہادی حسن رسوا علم ریاضی کے ماہر اور انسانی جذبات کے بیّاض تھے۔ ان کے ناولوں پر ان کے طبعی رجحان کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ ان کے ناولوں میں جنسیات سے لے کر سیاست تک کے سارے رجحانات فنی بصیرت سے لبریز نظر آتے ہیں انہوں نے کا ناول امراو جان ادا لکھ کر انسان کو یہ بتایا کہ انسانی زندگی کے پیچھے تہذیب

معاشرت، سیاست، معشیت، اخلاق اور تاریخ کے حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں جس کا مطالعہ کرنے سے ہم ماضی سے آشنا ہوتے ہیں اور اس کی روشنی میں ہم اپنے مستقبل کو سنوارتے ہیں اس کے بعد ناول نگاری میں مرزا سعید وغیرہ کا نام آتا ہے۔

مذکورہ بالا بنیادوں پر ہی اردو کے مایہ ناز ناول نگار پریم چند نے ناول نگاری کا تاج محل تعمیر کیا اور اس کی آبیاری کر کے ناول نگاری کے کارواں کو آگے بڑھایا۔ پریم چند نے اس دور میں ناول لکھنا شروع کیا جب کہ 'خواب ہستی' اور 'امراو جان ادا' منظر عام پر آچکا تھا۔ ابتداء میں انہوں نے ہندو معاشرت اور اس کی پیچیدگی پر مبنی اصلاحی ناول لکھے، ان ناولوں کا پس منظر انہوں نے ایسے معاشرے کو بنایا جس کا ان کو خود مشاہدہ تھا۔ اس طرح ان کے تمام ناول حقیقت اور صداقت کے غماز ہیں جہاں ان کے شدید جذبات اور غیر منطقی جانب داری کو خاص دخل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے ابتدائی ناولوں کو فنی طور پر کامیاب نہ بنا سکے جس درجہ کے ان کے ناول 'بازار حسن' 'گوشہ عافیت' میدان عمل' اور 'گئو دان ہیں۔ پریم چند کے ناول خاص طور سے 'گئو دان' اور 'میدان عمل' کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناول نگاری کے فن کی جس روایت کو نذیر احمد، سرشار شرر، رسوا اور مرزا سعید نے قائم کیا تھا اسے پریم چند نے فنی اعتبار سے مذید وسعت اور گہرائی بخشی۔

سرشار عمیق مطالعہ رکھنے کے باوجود نہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا محاصرہ کر سکے اور نہ ہی لازمی، غیر لازمی اہم اور غیر اہم میں فرق قائم کر سکے۔ پریم چند کے ناول معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی گوشوں کا اس طرح محاصرہ کرتے ہیں کہ ان کے ناول ان تمام چیزوں کے ساتھ ہی ایک خاص قوم کے مزاج کے مفسر اور مبصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں قومی زندگی کے خارجی پہلو کے ساتھ ساتھ ان کے داخلی کیفیتوں کی اس طرح عکاسی کی ہے کہ اس قوم کے جسم اور روح دونوں کے فرق عیاں ہو گئے ہیں اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے ناول ہندستان کے شہروں دیہاتوں کے نچلے اور متوسط طبقوں کی تہذیبی اور قومی الجھنوں اور کشیدگی کے آئینے ہیں۔ پریم چند کے ناول اردو ناول کی تاریخ میں زندگی اور فن کی عظمت اور بلندی کے بہترین مظہر ہیں۔

ان میں سب سے پہلے کے ناول نگاروں نے فن کی جو روایت قائم کی تھی۔ اسے انہوں نے وسعت ہی نہیں دی بلکہ اپنی فنی بصیرت سے ایک نیا مفہوم دیا۔ پریم چند کے ناولوں میں جہاں مارکن اور ٹالسٹائی کے نقطۂ نظر کو دخل ہے وہیں قدامت پسندی یا مشرق پسندی بھی غالب ہے۔

اس طرح پریم چند کے بعد جن لوگوں نے فن اور فلسفہ حیات پر مبنی ناول نگاری کی اور اردو ناول کو فنی اعتبار سے آگے بڑھایا ان میں سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، عزیز احمد، کرشن چند اور قرۃ العین حیدر کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے ادیبوں نے مارکسزم اور موجودہ سائنس اور سماجی علوم کی روشنی میں اپنا اظہار خیال کیا۔ ان لوگوں کا مقصد سماجی اصلاح تھا اور اس کام کو ان لوگوں نے ایک جذبہ امید اور پروگرام کے تحت بخوبی انجام دیا۔ اس کا پرچار ان لوگوں نے اردو ادب میں افسانہ لکھ کر کیا یہی وجہ ہے کہ شروع ہی سے ترقی پسند تحریک کا رویہ زندگی کے بارے میں صداقت پر مبنی تھا۔ سجاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی عزیز احمد اس زمانہ کے ناول نگار تھے۔ ان بزرگوں میں سوچنے سمجھنے اور اظہار خیال کا انداز جداگانہ تھا۔ یہ لوگ درمیانی طبقہ کے لوگ تھے قدامت پرستی رسم رواج اور اخلاقی بندھنوں کی چہار دیواری میں قید تھا جس کا مستقبل تاریک ہی تاریک نظر آرہا تھا جس کا احساس ان لوگوں کو شدت سے تھا کہ یہ طبقہ برباد ہونے جارہا ہے۔ یہ طبقہ اپنے قدیم رواج کی ڈوری میں جکڑا ہوا شاید ہمیشہ رہ جائے اور اس کا پھر بہت برا ہو جائے آخر کار انہوں نے اس طبقہ کے لوگوں کو تعلیم کی دعوت دی انسانیت اور جدید قدیم کے موضوع پر نہایت ہی خلوص و محبت کے ساتھ تبلیغ کی۔ یہ تبلیغ ان لوگوں نے تحریری اور تقریری دونوں طرح سے کی۔ ان لوگوں نے جدید سائنس کی روشنی میں اچھے مواد اور فن کی کسوٹی پر ناول نگاری کر کے متوسط طبقہ کے لوگوں کو بیدار کیا جیسا کہ سجاد ظہیر نئے ناول 'لندن کی ایک رات' میں اپنا دانشورانہ جذبات و احساسات اور داخلی اظہار خیال کی تکنیک سے تخلیقی حسن کو پیرا ہن بخشا یہ ناول سجاد ظہیر کی وہ نثری کاوش ہے جو 1938ء سے اب تک مسلسل شائع ہوتی رہی ہے ناولٹ کے متن اور مواد کی اہمیت کی پیش نظر

تنقیدی ایڈیشن بھی سامنے آتے رہے ہیں۔ یہ ناول اردو میں فنی نقطۂ نظر سے جدید ناول کی خشت اول ہے۔ لندن کی ایک رات ترقی پسند ادب کا ابتدائی نمونہ ہے۔ یہ ایک ایسا ناول ہے جو 1965ء سے پہلے لکھے جانے کے باوجود آج کے نئے زمانے سے بھی نہ صرف جڑا ہوا ہے بلکہ عکاس اور آئینہ دار بھی ہے کیونکہ آج بھی مغربی دنیا میں تعلیم حاصل کرنے والے طالب علموں کے مسائل زیادہ بدلے نہیں ہیں۔ تو عصمت چغتائی تحلیل نفسی کے ذریعہ شمن کے کردار کو اجاگر کیا اور گاؤں گھروں میں استعمال ہونے والی روزمرہ کی بول چال کو اردو ادب میں ادبی مقام بخشا۔ کرشن چندر نے خلقت کی ابدی حسن کے گود میں سماج کے مختلف طبقہ میں ہونے والے ظلم وستم انسان کی پریشانی اور بے بسی کے پردہ کو فاش کیا تو عزیز احمد نے تعلق دارانہ مشنری اور متوسط طبقہ کے سماج میں عام لوگوں کی تنگدستی اور دیگر بدحال کو اپنا موضوع بنایا۔ ان لوگوں کی ناول نگاری سماجی مسائل پر مبنی اعلیٰ شاہ کار ہے جس کے ذریعہ عام لوگوں کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ خواہ غریبی ہو یا باہمی کشیدگی یا ایک دوسرے پر ظلم وستم کے واردات۔ ہر مسائل اور مسائل کے حل کو اپنے ناولوں میں قلم بند کیا مگر پریم چند کے ناول 'گئودان' کی طرح نشاۃ حیات کا ہمہ جہتی رزمیہ نہیں۔ بہر حال ان لوگوں کا ناول فن اور اسلوب کے لحاظ سے بہت دلکش اور دلچسپ ہے جس کا نذیر احمد یا پریم چند کی ناول نگاری میں سراغ نہیں۔ ان ترقی پسند ادیبوں کے دل میں قوم کا درد تھا جو کچھ دیکھا اس کو محسوس کیا اور ناول کے سانچے میں ڈھال دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی ناول میں صداقت پر مبنی کردار ملتے ہیں۔ ان لوگوں کے ناول میں صرف اقربا پروری قدیم عقائد اور زمانے سے چلی آنے والی رسم ورواج کی کشمکش اور پیچیدگی ہی نہیں بلکہ آزادی، انصاف اور انسان دوستی کے نئے ادارے، نئی دنیا کی تلاش اور نئے خوابوں کی تعبیر بھی نظر آتی ہے۔ اعظم راونعیم، شمسا، سب کسی تعبیر کے خلاف رواں دواں نظر آرہے ہیں عصمت چغتائی نے اس عہد کے افسانوی ادب کے کرداروں کو یوں پیش کیا ہے۔

نئی دنیا کا نیا بیٹا ضدی۔ بدمزاج اور اکھڑ ہے وہ موجودہ

نظام کو پسند نہیں کرتا۔ اور اپنے نئے نظام کے لیے بیکل
ہے۔ وہ اسے بدل ڈالنا چاہتا ہے مگر ابھی تو وہ بدنظمی سے
متنفر ہو کر اپنی ہی بوٹیاں چبائے جا رہا ہے خود اپنا ہی جسم
اپنی ہی روح کو چیر کر پھینک رہا ہے۔

(مجموعہ ایک بات صفحہ 11)

اس بات سے کسے انحراف ہے کہ انگریزی دور حکومت میں ہندوستانی عوام غلامی کی زنجیر میں جکڑے ہوئے تھے۔ بڑے لوگ مزدور طبقے کو استعمال کرنے کے لیے نئے نئے طریقے ایجاد کر رہے تھے۔ اس بدعنوان حکومت کی بدنظمی حارحانہ رویہ قید و بند کے نظارے متزلزل اونیم مردہ حالات ان ترقی پسند ادیبوں کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ مجاز کی نظم 'آوارہ' میں ہیرو کا کردار اسی نوعیت کا ہے۔ جب ترقی پسند ادیبوں کے علاوہ گاندھی جناح اور دوسرے رہنماؤں کے خون پسینہ کے صدقے ہندوستان آزاد ہوا تو ہندوستانیوں کے لیے جسمانی اور روحانی دونوں آرام کوسوں دور ہو گئے۔ مذہب کے نام پر نفرت بغض و کینہ، فسادات قتل عام اور حیوانیت کے خوفناک رویہ کا آغاز ہوا تو ترقی پسند ادیب خوشگوار آزادی کا یہ نتیجہ دیکھ کر خوف سے چیخ پڑے۔ ایسے موقع سے 'کرشن چند' نے غدار اور رامانند ساگر نے اور انسان مر گیا تخلیق کر کے اپنے دل کا بھراس نکالا۔ اس کے علاوہ ایسے موقع سے ادیبوں نے بے شمار افسانے اور ناول تخلیق کر کے اس کے پس منظر میں اخوت، مروت، انسان دوستی، بھائی چارگی، قومی یکجہتی کی تلقین کی۔ اس سے قبل کے افسانوں میں فکر کی گہرائی اور تنظیم کا فقدان ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ناول ناول اور افسانہ افسانہ کہلانے کا مستحق نہیں دراصل وہ دور ہی بحران اور خلفشار کا دور تھا ان ادیبوں کا فرض تھا کہ فوری طور پر حالات کو قابو میں لا کر ماحول سازگار بنائیں۔ البتہ ایسے وقت میں ان لوگوں نے جذبات سے کام لیا جس کی وجہ سے ان لوگوں کی تخلیق میں فکر و فن کی کمی نظر آتی ہے۔

بہر حال پرچم آزادی کے تلے ظلم و ستم مذہب کے نام پر فرقہ وارانہ فسادات اور مختلف قسم کے

واقعات رونما ہوئے۔اس کی برقی رو نے دل و دماغ کو جھنجھوڑ ڈالا اس کے دو نتائج برآمد ہوئے اول کچھ لوگ ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے دوسرا ہندوستانی سماج میں جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہوا۔ظلم و زیادتی کی دیوار گر گئی اور عام لوگ خوشگوار زندگی گزارنے لگے۔اس عہد میں قاضی عبد الستار اور انور عظیم جیسے ناول نگاروں نے جاگیردارانہ نظام کے خلاف ناول لکھا۔ان کا ناول 'شب گذیدہ' اور 'دھواں دھواں سویرا' اس امر کی عمدہ مثال ہے۔اور قرۃ العین حیدر کا ناول 'میرے بھی صنم خانے' سے بھی اس بدعنوان نظام کا شیرازہ بکھرنے کی گونج سنائی دیتی ہے۔ساتھ ہی قاضی عبد الستار اور انور عظیم نے اپنے ناول میں تاریخی و طبقاتی شعور کے مطالعہ و مشاہدہ کے ذریعہ اس جارحانہ نظام میں ہونے والے ظلم و ستم اور عام انسان کی محنت کا استحصال کی داستان بہت ہی موثر اور فنی چابک دستی سے قلم بند کیا ہے۔بیسویں صدی کے ناول نگاروں میں خان محبوب طرزی بھی ناول نگار کی حیثیت سے منفرد مقام رکھتے ہیں۔

انہیں دنوں ہندوستانی کاروبار اور تجارت کے ذریعہ معاشی زندگی کو خوشگوار بنانے کی کوشش میں سرگرداں تھے۔اس میں کئی طبقہ کے لوگ تھے خاص طور سے مزدور اور ردمیانی طبقہ کی حالت دگرگوں تھی ان کے سامنے مسائل کے انبار لگے ہوئے تھے جن مسائل سے ان کا چولی دامن کا رشتہ تھا اس طرح وہ لوگ مالی بحران کے باعث غربت کے شکار ہو رہے تھے۔آزادی کے آفتاب کی خوشگوار شعائیں سرمایہ داروں اسمگلروں، بدعنوان افسروں، ڈھونگی سیاسی رہنماؤں کے شبستانوں کو معمور کر رہی تھی۔غریبوں کا استحصال ان کا نصب العین تھا۔ان کی خواہش تھی کہ یہ نچلا طبقہ ترقی کے راستہ پر کبھی گامزن نہ ہو سکے۔وہ زندگی کے ہر شعبہ میں تنزلی پر گامزن رہے۔اس کارنمایاں کو جن ترقی پسند ادیبوں نے انجام دیا اس دردناک زندگی کو اپنے تخلیق کا موضوع بنایا ان میں ہنس راج رہبر مہندر ناتھ کرشن چند، رضیہ سجاد ظہیر، سہیل عظیم آبادی وغیرہ کے اسم گرامی اہمیت کے حامل ہیں۔پریڈ گراونڈ 'بندگی' رہبر کے درد کا رشتہ 'سورج' ریت اور 'گناہ' مہندر ناتھی کی ناول سے سماجی ماحول کی پرتو ایسی جلوہ گر ہوئی ہے جس کا دیگر اردو ناولوں میں موہوم سا اشارہ بھی نہیں ملتا۔ان

کے ناول میں گاؤں اور قریہ کے مزدور افلاس و بھوک اور بے روزگاری کے ستائے ہوئے افراد نظر آتے ہیں۔ ان کی زندگی گندے اور غیر کشادہ جگہوں میں بسر ہوتی ہے مگر وہ مظلوم امید کی خوشی کے ساتھ خوشگوار طریقہ سے زندگی بسر کرنے کا خواب دیکھتا ہے۔ وہ اس کو حاصل کرنے کے لیے ہر ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ یہاں میں مہندر ناتھ کے ناول 'سورج' 'ریت اور گناہ' سے عبارت نقل کر رہا ہوں جو اسی نوعیت کی چیز ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ہیروئن انوری میری سے کہتی ہے۔

> دھوپ کتنی تیزی سے ہماری طرف آرہی ہے میری جب تک انسان میں زندگی ہے اسے لڑنا چاہئے۔ دیکھو تو یہ سمندا کا شفاف سینہ پاکیزہ ہوا۔ ناریل کے درخت یہ لہریں یہ سورج، یہ ریت ہمارا تمہارا گناہ یہ کھلی فضا اور یہ راحت بخش ہوا جو پھیپھڑوں میں جاتی ہے ہم کیوں نہ زندہ رہیں اور ایک بہتر زندگی کے لیے لڑیں۔

ان ناولوں میں محنت کش مزدور کے حالات زندگی کو انہی کی نظر سے دیکھا اور قلم بند کیا گیا ہے یہاں ناول میں ناول نگار نے خود کو ناول کا کردار بنا کر پیش کیا ہے جس سے ان کی شخصیت میں چار چاند لگ جاتا ہے۔ ناول نگار اسی محنت کش دہقان کے دل و دماغ سے سوچتا اور انہیں کے عام بول چال کی زبان میں اظہار خیال کر کے دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔ چنانچہ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند کی ناولوں کے اثرات ان بزرگوں کے ناولوں میں سیر و تفریح کرتی نظر آتی ہے۔ جو اردو کے دیگر ناول نگاروں نے انجام دیا ہے۔ بحیثیت ناول نگار موصوف کی خدمات ناقابل فراموش ہیں انھوں نے اپنے ناول 'صورت الخیال' میں ایرانیوں، انگریزوں اور ہندوستانی، دیہاتی انسانوں کی زبانیں مرقوم و محفوظ کر دیئے ہیں۔ جو اردو ناول نگاری کی ارتقا میں سنگ میل کا حکم رکھتی۔

راجندر سنگھ اردو دنیا کے علاوہ انگریزی ہندی کے میدان میں تعارف کے محتاج نہیں۔ افسانہ

نگاری کے میدان میں جو مقام ان کو حاصل ہے کسی اور کو میسر نہیں ان کی ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' کی شہرہ آفاق ہونے کی پوشیدہ بات اسی صداقت میں مخفی ہے۔ بیدی نے اپنے ناول کے کرداروں میں جان ڈالنے کے لیے اپنی ہستی کو انہی مظلوم کسانوں کے درد و کرب میں اپنے آپ کو محو کر دیا ہے۔ بیدی کی یہ ناولٹ گئودان کی طرح پنجاب کے دیہی علاقے کی منظر کشی کرتا ہے۔ جہاں غریب مزدور محنت کر کے روزی روٹی حاصل کرتے ہیں۔ وہ تہذیبی ماحول کی منظر نگاری کے ساتھ ساتھ کرداروں کی تہداری کو بھی ڈرامائی انداز سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بہر حال یہاں 'لہو کے پھول' حیات اللہ انصاری کے ناول کا ذکر کرنا غلط نہیں ہوگا۔ موصوف کا ناول 'لہو کے پھول' بیسویں صدی میں ہندوستان کی تحریک آزادی پر مبنی ہے۔ حیات اللہ انصاری اجتماعیت سے خفگی کے بعد بھی ترقی پسند نظریہ ادب سے منہ نہ موڑ سکے۔ انہوں نے ناول میں انسانی زندگی اور تحریک آزادی کا جس پیمانہ پر مطالعہ و مشاہدہ کیا وہ ایک خاص سیاسی اور سماجی نقط نگاہ کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں ہندوستانی عوام اور ان کی آزادی کی کوششوں کو بڑے ہی مفکرانہ اور دانشوارانہ انداز میں رقم کیا ہے۔ ویسے ان کا یہ ناول بہت ضخیم ہے جس میں مصنف نے بے ضرورت وسعت پیدا کر کے قصہ کو طول دے دیا ہے۔ یہ چیزیں ناول کو غیر متوازن بنا دیتی ہے۔ پھر بھی یہ ناول اشتراکی تحریکوں اور دیہات کے ماحول سے تعلق رکھنے والے اردو کے شہرت یافتہ اور مقبول ناولوں کی فہرست میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی ناولٹ 'گھروندہ' اور 'مدار' ہے جس میں 'گھروندہ' کافی طویل ہے اس کا قصہ یوں ہے کہ ایک بڑے گھر کا لڑکا ایک بیراگن کے شباب پر عاشق ہو جاتا ہے کافی دشواریوں کے بعد لڑکا لڑکی شادی کر لیتے ہیں اس کے بعد دونوں کے درمیان تہذیب و تمدن کا مسئلہ کھڑا ہوتا ہے۔ مگر دونوں اپنے اپنے تہذیب و تمدن پر ہی اٹل رہتے ہیں جو روایت ایک دوسرے کے جداعلی سے چلی آ رہی تھی۔ ناولٹ 'مدار' کے ذریعہ حیات اللہ انصاری مادری زبان کو ترجیح دیتا ہے۔ اس نے ثابت کیا ہے کہ مادری زبان کا رشتہ اہم ترین رشتوں اور جذبوں پر فضیلت رکھتا ہے۔

اس کے بعد پاکستانی ادیبوں نے بہت زور شور سے ناول لکھے ہیں جو اچھوتے موضوع فن تکنیک اور فکری احساس پر مبنی ہے مگر حالات حاضرہ کے مسائل کو جنہوں نے اپنے ناول کے لیے موضوع کا مرکز بنایا یعنی عام انسانوں کی سماجی زندگی میں آئے دن جو واردات رونما ہوتی ہیں سیاسی، معاشی، اقتصادی مسائل کھڑے ہوئے ہیں ان کو تنقیدی نقطہ نظر سے صداقت کے پرلگا کر پیش کیا ان ناول نگاروں میں خاص خدیجہ مستور کا 'آنگن' 'اداس نسلیں' عبداللہ حسین اور خدا کی بستی جانگلوس شوکت صدیقی کا خاص طور سے مشہور و معروف ہیں پہلے دونوں ناولوں کے ذریعہ آزادی سے قبل کی انسانی زندگی کو مصنف نے بڑی چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ اور دونوں کا اختتام ملک کی تقسیم پر کیا ہے۔ دونوں ناولوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آغاز سے اختتام تک ایک پائیدار نقطہ نگاہ، تاریخی، سماجی گہرائی و گیرائی کا سلیقہ پنہاں نظر آتا ہے۔ خدیجہ مستور اپنے ناول آنگن کے ذریعہ ایک درمیانی درجہ کے مسلم خاندان کے حالات بڑی منصفانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ اس بات کی وکالت کرتی ہیں کہ گھر میں جو چھوٹے موٹے واقعات نمو پزیر ہوتے ہیں وہ دراصل ملک کی اشتراکی زندگی میں پیدا ہونے والے مسائل کا مرہون منت ہے۔ انگریزی حکومت کے خلاف جو لڑائی باہر لڑی جاری تھی اس میں سپاہیوں کی مستقل مزاجی جوانمردی موت اور تباہی کا سچا نظارہ اندرون میں نظر آتا ہے۔

شوکت صدیقی نے اپنے دونوں ناولوں میں پاکستانی ماحول کی دگرگوں پیچیدہ حالات کو پیش کرنے کی جستجو کی ہے۔ پاکستان کے نصف جاگیردار نصف متوسط طبقہ اور سماج کے لوگ مذہب کی آڑ میں برملا ہونے والی جرم کی حمایت کرتے ہیں اور انساں کی ایک شہری ہونے کی حیثیت سے جو بنیادی حقوق ہیں اس کو نیست و نابود کرنے کی جو مہم چلی آرہی ہے شوکت صدیقی نے بڑی ہمت اور بہادوری سے ناولوں کے الجھے ہوئے پلاٹ میں ان کو یکجا کیا ہے۔ ان کا ناول 'خدا کی بستی' میں 'سلمان' سلطانہ نیاز، علی احمد کے کردار اردو ناول کے مستحکم کے کرداروں میں انفرادی مقام رکھتے ہیں۔ جانگلوس میں پاکستان دیہاتی علاقوں میں حیوان صفت زندگی بسر کرتے ہیں اسی صورت

حال کوموضوع بنایا ہے اور یہ بات غور طلب ہے کہ ایک لکھنوی ادیب دیگر زبان دوسرے تہذیب و تمدن رسم ورواج ماحول اور معاشرہ کی رنگارنگی انسانی زندگی اور نفسیات کو دل کش اور موثر طریقے سے پیش کیا ہے۔ لالی اور رحیم داد اس ناول کا مرکزی کردار ہیں جو جیل خانہ سے باہر نکل گئے ہیں اس طرح شوکت صدیقی نے اسی ناول میں اس بات کی دلیل پیش کی ہے کہ اس سماج میں اصل مجرم جو گناہ گار ہیں وہ قید خانہ کے اندر نہیں بلکہ باہر عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے۔ یہ بہت بڑے سیاستداں ہوتے ہیں اور حکومت میں بڑے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔ سید شیر حسین نے اپنے ناول 'جھوک سیال' میں ایک گاؤں کے آئے دن ہوئے واردات کو قلم بند کیا ہے مگر جانگلوس اس کے برعکس ہے یہ ناول پورے پنجابی دیہاتی علاقے کی زندگی پر محیط ہے۔

ترقی پسندی کے علمبرداروں نے پرانے رسم ورواج جو عام طور پر صداقت پسندی پر مبنی تھے اس سے الگ ناول نگاری کے اصولوں وضابطے قائم کیے جیسا کہ خواجہ احمد عباس کا ناولٹ 'سیاہ سورج سفید سائے' اس میں مصنف نے اشتراکی جمہوریت پر چلنے والے نو آبادی ملکوں کے خلاف جاگیردارانہ نظام کی جارحانہ ظلم وستم کا پردہ فاش ہے۔ خواجہ احمد عباس نے بھی حیات اللہ انصاری کی طرح ہندوستانی عوام اور ان کی آزادی کی جستجو کو قلم بند کیا ہے۔ اس کے علاوہ کرشن چندر نے پور کائینات کی جاگیردارانہ نظام کی جارحانہ ظلم وستم سماجی نابرابری اعلی ادنی کا بھید بھاولوٹ کھسوٹ خوشحال زندگی گذارنے کو اشارہ کنایہ کے ذریعہ بااثر بنا کر پیش کیا ہے۔ انہوں نے دبے کچلے استحصال زدہ کشمیریوں کے بارے میں بہت کھل کر قلم بند کیا ہے۔ جیسے 'گدھے کی سرگذشت' 'الٹا درخت' اسی نوعیت کی تخلیق ہے جس میں برائے نام عوامی یا جمہوری نظام کے کل شعبہ جمہوریت انصاف قانون اور سماجی رشتوں کے ریاکارانہ ومکارانہ رویہ پر سخت تیر چلایا گیا ہے۔

کرشن چندر نے کم وبیش پچاس ناول لکھے ہیں۔ ان کے سماجی ناول کے غائر مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں مواد اور تکنیک کی گوناگونی ہے۔ 'شکست' کا موضوع محنت کش مزدور کا خون چوسنا اور جاگیرداروں کی رہنمائی میں فرقہ وارانہ فسادات کو فروغ دینا ہے۔ 1952ء میں کرشن

چندنے جب 'کھیت جاگے' تخلیق کر کے محنت کش مزدور کی زندگی اور حالات کو دنیا کے سامنے پیش کر دیا اس میں باغی راگھونے اپنی المناک داستان زندگی میں بیان کی ہے جس کو دوسرے دن سولی پر چڑھایا جائے گا۔۔۔'مٹی کے صنم' اور 'میری یادوں کے چنار' کی تکنیک آپ بیتی ہے اس میں ناول نگار نے اپنی یادوں کے ذریعہ انگریزی دور حکومت کے ظلم وتشدد کو بیان کیا ہے۔۔۔۔دل کی وادیاں سو گئیں بھی تکنیک کے اعتبار سے نہایت ہی اچھا اور دلچسپ ہے۔ایک مسافر ٹرین کے حادثہ کی وجہ سے چند دن بیابان جنگل میں گذارتا ہے جس کی رسائی سماج کی متعدد حلقوں سے ہے۔وہاں وہ اپنی شناخت دے کر اپنا مدعا کا اظہار کرتا ہے۔دادر ریل کے بچے جو بمبئی کی اوسان خطا کر دینے والی زندگی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔اس میں بھی جاگیردارنہ نظام کی شیطانیت و حیوانیت کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔اس طرح 'ایک عورت ہزار دیوانے' 'برف کے پھول' جیسے ناول ہیں۔یہ صداقت پر مبنی ہیں کرشن چندر کی حقیقت نگاری میں حقیقت کا پرتو کچھ گہرا نہیں یہ اور بات ہے مگر وہ اپنے آپ کو اس کے لیے کوشاں رکھتے ہیں مگر اس کے بعد بھی وہ اپنے ناولوں میں ہندوستانی سماج کی پناہ گزین انسانوں کی زندگی اس کی مشکلوں پریشانیوں اور رویوں کا بڑی چابک دستی سے حصار کرتے ہیں جو کسی دوسرے ناول نویس کو میسر نہیں۔

قرۃ العین حیدر اردو ناول کا ایک مستقل اور علیحدہ باب کہی جاسکتی ہیں۔انہوں نے اردو ناول کے فن کو تازگی فکر اور معنویت بخشی ہے۔وہ ان ہی کا حصہ ہے انہوں نے اپنا پہلا ناول 'میرے بھی صنم خانے' کے شروع میں اردو نوابوں تعلقداروں جاگیرداروں کی عیاشی معاشقہ رنگارنگ محفل کی اور آخر میں جنگ آزادی کی تباہی و بربادی افلاس ومصیبت کے المناکی کی عکاس کے ہندوستانی مسلمانوں کے بگڑے ہوئے معاشی کی اصلاح کرانے کی کوشش کی ہے۔یہ ناول اس دور کے اودھ کا سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی، مذہبی تمام پہلو نمایاں کرتا ہے جہاں شرفا، روسا معاشقے سیر و شکار رقص وسرود شراب و شباب میں مگن گھر کے بجائے کلب میں پارٹی اور پکنک منا رہے ہیں۔ساتھ ہی ادب آرٹ فلسفہ حیات کے ماہر اور بورژ روایت، پرولتاریت کا دلدادہ ہے۔اس ناول

میں ہندوستان کے متعدد تحریکوں کا سراغ وشعور رواں دواں ہے ۔ ناول کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مصنفہ کو قوم پرست مسلمانوں کے گروہ سے حد درجہ محبت وانسیت ہے۔ان کا دوسرا ناول' سفینۂ غم دل' ان کی اپنی آپ بیتی پر مبنی ہے۔جس میں مصنفہ اپنے عزیز واقارب کے ساتھ نظر آتی ہے۔اس ناول کی ابتداء مصنفہ کی خاندانی معاشرت کی تاریخ پر اور اختتام تقسیم ہندو پاک پر محیط ہے کہ جب ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف تحریکیں شروع ہوئیں تو آئے دن کہیں نہ کہیں دنگا فساد، گورے اور ہندیوں کے درمیان کشیدگی، سیاسی ، معاشی ، مذہبی، اقتصادی تعلیمی بدامنی سے متاثر ہو کر مصنفہ مع اپنے خاندان کس طرح درد وغم کو سینے سے لگا کر سخت سے سخت مراحل سے گزر کر اپنے بزرگوں کو پاکستان جاتے ہوئے دکھلاتی ہیں۔

اس طرح مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے دونوں ناول اودھ کے تعلقدار خاندان کی مکمل تاریخ ہے جس میں ان کی معاشرت کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔جس معاشرت پر مغربی تہذیب کا اثر حد درجہ غالب ہے۔ان کے ناول صداقت کی غمازی کرتے ہیں۔ساتھ ہی مصنفہ کا سب سے شاہکار ناول' آگ کا دریا' ہے جس پر ان کو گیان پیٹھ ایوارڈ ملا ہے۔یہ ناول قومی یکجہتی کا ضامن اور اردو ناول کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ان کے تمام ناولوں میں تخیل کارفرما ہے اس کے علاوہ' کار جہاں' 'دراز' 'آخر شب کے ہم سفر' 'چاندنی بیگم ،گردش رنگ چمن' 'ہاؤسنگ سوسائٹی (ناولٹ) جیسے ناول لکھ کر مصنفہ نے اردو ناول نگاری کے کارواں کو آگے بڑھایا ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید کی ترجمانی قرۃ العین حیدر کے ناولوں 'میرے بھی صنم خانے ،آگ کا دریا، کار جہاں دراز ہے اور آخری شب کے ہم سفر کے مطالعہ سے اول اول یہ بات سمجھ میں آئی کہ کوئی بھی ناول شاہکار کی حیثیت اسی وقت اختیار کرتا ہے جب ناول نگار تخلیقی سطح پر اسے برتنے کا اپنا ایک مخصوص اسلوب تراشتا ہے۔خواہ وہ اسلوب وہ طریقہ کار، مروجہ اسلوب اور طریقہ کار سے مختلف یا یکسر برعکس ہی کیوں نہ ہو۔اس اعتبار سے تخلیقی سطح پر ناول کو برتنے کے لیے دو متوازی خطوط قرار پاتے ہیں۔ایک فنکرانہ اور دوسرا دانشورانہ فنکاری کی سطح پر ناول نگار ناول کے مروجہ لوازمات (ہیت و

تیکنک وغیرہ) کو اپنے طور پر برتتا ہے اور منفرد تخلیقی قوت اور فنکارانہ بصیرت سے کام لے کر ہیئت و تکنیک، موضوع اور اسلوب میں نت نئے تجربے کر کے ناول کے فنی امکانات کو وسیع سے وسیع تر کرتا ہے۔ دوسری جانب ناول نگار دانشوری کی سطح پر اپنے فن کے توسط سے موضوع یا موضوعات سے متعلق کردار یا واقعہ کے حوالے سے یا تو کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے یا پھر زندگی اور اس کی مختلف کروٹوں سے متعلق کہی ہوئی باتوں کے تناظر میں ان سے متعلق حقائق کیفیات اور حیات کی کچھ اس طرح نقاب کشائی کرتا ہے کہ قاری کو یہ فیصلہ کرنے میں دشواری نہیں ہوتی کہ جو حقیقت اس کے سامنے ہے خود اس کی حقیقت کیا ہے۔ فن کی تخلیق میں خصوصاً ناول کی تخلیق میں فنکاری کے ساتھ دانشوری کو بھی وقار و معیار کے ساتھ برتنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ فنکارانہ رچاؤ تو کوئی بھی شخص مشق اور مطالعے کے ذریعے پیدا کر سکتا ہے لیکن دانشورانہ رچاؤ کے لیے ایک مخصوص ذہنی ساخت کی ضرورت ہوتی ہے جو شاعری میں صرف غالب اور اقبال کے ہاں نظر آتی ہے لیکن فکشن میں قرۃ العین حیدر ہی ہیں جن ہاں فنکاری ہی نہیں دانشوری کی بھی اعلیٰ ترین روایات ملتی ہیں۔ 'آخر شب کے ہم سفر' متحدہ ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی بنیادوں پر اس خطے میں رونما ہونے والے سیاسی اور ذہنی انقلابات کی دستاویز ہے۔ جس میں کہانی بنگال کی انتہا پسند اور انقلابی تحریک سے شروع ہوتی ہے۔ اور 'بھارت چھوڑو' آندولن' مطالعہ پاکستان اور تقسیم ملک کی منزلوں سے گزرتی ہوئی بنگلہ دیش کے قیام تک پہنچتی ہے۔ اس دوران ان کی کہانی مختلف موضوعات کی بنا پر ان گنت واقعات کو اپنے بہاؤ میں لے کر آگے بڑھتی ہے یہ واقعات اس خطے کی سیاسی کروٹوں کو بھی آشکار کرتے ہیں اور نئی اور پرانی تہذیبوں کے تصادم کو بھی۔ ان میں رومان اور محبت کی دھیمی دھیمی آنچ بھی ہے۔ اور وحشت اور بربریت کے گھناونے خنجر بھی۔ مثلاً دیپالی سرکار کا اپنے ہی گھر میں نقب لگانا سیاسی مقاصد کے لیے نواب قمر الزماں چودھری اور اس کے اہل خاندان کا قتل کماری امارائے کی ریحان الدین احمد کے لیے تڑپ اور کسک۔ یہ اور ان جیسے واقعات ناول کو اس کے فن سے بڑی حد تک باندھے ہوئے رکھتے ہیں لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب

نہیں کہ 'آخر شب کے ہم سفر' واقعاتی ناول ہے بلکہ اس ناول میں سب سے زیادہ نمایاں اس کے کردار اور ان کرداروں کے اسرار ہیں۔ مثلاً دیپالی سرکار ریحان الدین احمد، کماری امارائے۔ چرڈ بارلو۔ نواب قمرالزماں چودھری بھوتارنی دیوی، جہاں آرا، یاسمین، بلمونٹ وغیرہ ہر کردار اپنے اعمال اپنے نصب العین اور مزاج کی بنا پر ایک منفرد کردار قرار پاتا ہے۔ جو سکڑتا ہے تو خود قرۃ العین حیدر کے فکر و فلسفہ حوصلہ او جدوجہد، انسان دوستی اور حریت پسندی کی علامت بن جاتا ہے اور پھیلتا ہے تو پورے برصغیر کی سیاست، معیشت، تہذیب اور ثقافت کو سمیٹ لیتا ہے۔ مثال کے طور پر دیپالی سرکار ایک روایت پسند شریف ہندو خاندان کی فرد ہونے کے باوجود دہشت پسند تحریک میں شامل ہو جاتی ہے۔ اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے خود اپنے ہی گھر کو لوٹ کر اپنا ہی اثاثہ تحریک کی نذر کر دیتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں کی طرح اپنے ناولوں میں بھی مروجہ تیکنک کی خلاف ورزی کے باوجود فضا واقعہ کردار اور موضوع کو ایک ساتھ کچھ ایسے فنی رچاؤ کے ساتھ پیش کیا ہے کہ جہاں پر واقعہ اپنی پوری شدت کے ساتھ سامنے آتا ہے وہاں کردار دبتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ اور جہاں پر کردار پورے ناول کے وقار کے امین نظر آتے ہیں وہاں واقعہ پس منظر میں نہیں چلے جاتے بلکہ واقعہ اور کردار دونوں ایک دوسرے سے تحریک پا کر اس مخصوص دانشورانہ فضا کو تشکیل دیتے ہیں جس پر قرۃ العین کا انحصار ہے۔ 'آخر شب کے ہم سفر' پڑھتے ہوئے قدم قدم پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ واقعہ کردار میں اور کردار واقعہ میں رنگ بھرتے ہوئے چلتے ہیں۔

اس کے بعد جن ناول نویسوں نے اردو ناول نویسی میں شہرت حاصل کی ان میں جوگیندر پال، سجاد انور، درجہ اولیٰ کے مالک ہیں۔ حال ہی کی عمدہ مثال 'فراڈ' 'خضر میانی' 'نادید' اور بیانات جو گندر پال کی ناولیں ہیں جو دیگر بیانیہ ناول سے مختلف علامتی کردار کے مالک ہیں۔ وہ اپنے ناول میں تین اہم کردار کے ذریعہ پیش کی ہے جو ذہنی بیداری ہی نہیں مادی سماجی معیار پر وہ تین طاقتیں ہیں جو آپسی طور پر ٹکرا جانے والا ہے۔ ایک طرف سائنس ٹکنالوجی کی عطا کی ہوئی میکانکی اور بناوٹی تہذیب ہے جو ناول کا کردار دلیپ کی بنجر زمین ہو گئی ہے تو دوسری جانب آرٹ ادب اور دیگر تخلیقی

کارنامے جس میں آج بھی انسانی قدر اور جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔اس تخلیق میں فنکارانہ بصیرت اس کی شناخت ہے اور اس ناول کی ہیروئن بذات خود زندگی ہیں' نادید' بھی کچھ ایسی نوعیت کی چیز ہے۔آپ دیکھیں گے کہ ظاہری طور پر یہ چند نابینوں کی داستان ہے مگر جب آپ اس ناول میں اتر کر غائر مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوگا کچھ نابینا بصیرت والوں سے زیادہ وسعت نظر رکھتے ہیں۔

جوگندر پال کو عوام کی طاقت و دانائی پر بہت بھروسہ ہے وہ عام انسانوں کی دگرگوں حالت دیکھ کر پریشان رہتے ہیں۔ناول کی فنی اور جمالیاتی وقار کا سبب زبان و بیان کا خوش نما استعمال ہے۔ اس ذریعہ سے جوگندر پال اپنے کرداروں کے روحانی تجربات میں قاری اور خود کو بھی شامل کرتے ہیں وہ اپنے ناولوں میں انسانی صورت حال میں معنی کی نئی سمتوں کی جستجو کرتے ہیں۔

خوشیوں کا باغ اور جنم انوروپ انور سجاد کا ناول ہے وہ اپنے ناولوں میں اختیار کی روایت سے گزیر کر کے ناول کے فن کو شاعری اور مصوری کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔اس اعتبار سے اردو ناول نویسی میں ان دونوں کو تجرباتی ناول کہہ سکتے ہیں۔حالانکہ قصہ یہ ہے کہ انور سجاد کا اسلوب منفرد ہے عہد مقام اور کہانی کی ٹوٹ پھوٹ ان کے افسانوں کی طرح ان کے ناولوں میں بھی عیاں ہے۔اس بات کی طرف صراحت شمیم حنفی اور دیگر عہد حاضر کے بڑے بڑے نقادوں نے کی ہے۔اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ انور سجاد کا تعلق ترقی پسند تحریک سے رہا ہے یا نہیں۔ مجھے اس بحث سے مطلب نہیں مگر ایک بات ضرور ہے کہ انور سجاد ایک نرم دل انسان تھے وہ عام لوگوں سے محبت رکھتے تھے۔وہ انسانی فلاح و بہبودی کے لیے سماجی اور سیاسی دونوں اعتبار سے اپنے آپ کو لگائے رکھتے ہیں۔اس بات کی تصدیق مجھے ان کی ناول نگاری سے ہوئی ہے۔اس میدان پر وہ اپنے ہم عصروں سے اعلیٰ و بالا ہیں۔وہ حالات حاضرہ کے بگڑے ہوئے سیاسی سماجی حالات ظلم و ستم زور زبردستی کیے جانے والی عوامل استحصال شیطانیت اور حیوانیت کے خلاف ببانگ دہل آواز بلند کرتے ہیں۔ان کا نثری اسلوب اتنا شاندار اور دل کش ہے کہ وہ اپنے اظہار خیال کے غرض و غائت مقاصد فکر نظر وہ کیا چاہتے ہیں اس کو اپنے قارین تک پہنچا سکتے ہیں مگر حیف

کہ وہ حد درجہ الجھے ہوئے اور تجرباتی تکنیک قلم بند کر کے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔ ان کے ناولوں کا مطالعہ کر کے اس کو سمجھنا عام لوگوں کے بس کا روگ نہیں ہے۔ ایک گریجویٹ قاری جزوی طور پر سمجھ سکتا ہے مگر وہ بھی مرعوب ہو کر رہ جاتا ہے۔ دراصل انور سجاد جس الجھے ہوئے اور پیچیدہ مسائل کو اپنے ناولوں میں پیش کرنا چاہتے ہیں اسے کمال فن نہیں کہتے اپنی بات کو کہنے کے لیے الجھے ہوئے تکنیک کا سہارا لے یہ کمال نہیں بلکہ وہ ایسا تکنیک اپنائے کہ عام قاری ان کے مرکزی خیال کو سمجھ سکے۔ اور تنقید و تبصرہ کر سکے۔

اردو میں بیشتر تاریخی ناول قدیم اور پرانے رسم و رواج پر مبنی لکھی گئی ہیں جس میں نقطہ نگاہ کو بہت دخل ہے۔ دراصل ابتدا میں تاریخی ناول کے ذریعہ مذہبی عقائد کی تبلیغ کی جاتی تھی اس کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے اردو ناول میں ہیرو ہیروئین کا تذکرہ نہیں ہونا تھا جس کے نتیجے میں تاریخی ناول کی ترقی نہیں ہوئی ترقی پسند ادیبوں نے اس کے لیے بھی کافی جدو جہد کی۔ ان بزرگوں کا خیال تھا کہ تاریخی ناول قدیم سماجی تاریخ پر مبنی ہو اور قومی یکجہتی انسانی دوستی اخوت مروت اور بھائی چارگی کا ضامن بھی اس اعتبار سے قرۃ العین حیدر کا ناول 'آگ کا دریا' کو تاریخی ناول کہہ سکتے ہیں۔ یہاں گذرے ہوئے زمانہ کا تہذیبی میراث اور فکری سرمایہ سے ان کا رشتہ کسی احیائی یا قدمات پسندانہ ذہنی رویہ کا ثبوت فراہم نہیں کرتا ہے بلکہ اس کے برخلاف وہ بیتے دنوں کی روشنی میں موجودہ زمانہ کو پرکھ کر سازگار اور خوشگوار بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اجتماعی طور پر ان کو اپنے ناول کا موضوع تاریخ بنانے کا مقصد جاگیردارانہ اور نا اہل طبقہ کے ظلم و ستم کے خلاف صدائے احتجاج کرنے اور انسان دوستی کو دعوت دینے کا ہے۔ ان نمام چیزوں کی تلاش انہوں نے متعدد تحریکوں اور فلسفوں کی روشنی میں اپنے مطالعہ ومشاہدہ کی بنیاد پر کی ہیں۔ یہی چیز ان کی ناول کو شہرت بخشتی ہے۔ قاضی عبدالستار اور عزیز احمد نے بھی اپنی تاریخی ناولوں میں زندگی کے وسیع تہذیبی اور انسانی رشتوں کو پیش کیا ہے۔ قاضی عبدالستار نے اپنے ناول 'داراشکوہ' میں ہندو پاک کی تاریخ کے ایک خاص چوراہے پر رک کر ہے مخالف طاقتوں کی صداقت پسندانہ مصوری کی ہے

اور ثابت کیا ہے کہ عہدہ وحکومت حاصل کرنے کے لیے جو جنگ لڑی گئی ایسے موقع سے ترقی پسند ادیب ان دشمن انسانیت گروہ کی طاقت کو ختم کرنے کے لیے معرکہ آرا تھے۔انہوں نے اپنے ناولوں میں تقسیم ہند سے پیدا شدہ پیچیدہ، اقتصادی، سیاسی، سماجی، معاشی، جغرافیائی اور ثقافتی مسائل کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

فی زمانہ 'جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں'۔عزیز احمد کا ایک اہم ناول ہے۔اس میں امیر تیمور کی سوانح حیات کو ایک کامیاب حکمراں کی جگہ ایک عام انسان کی طرح پیش کیا گیا ہے۔اور یہ ثابت کرنے کی گئی کوشش کی ہے کہ ایک انسان جو بچپن سے جوانی تک کا سفر طے کر کے ضعیفی کو پہنچ جاتا ہے اس وقت وہ انسان نرم دل سنجیدہ اور معلم اخلاق بن جاتا ہے۔ساتھ ہی وہ اپنے بچپن اور جوانی کا تصور کرتے ہیں جس سے وہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکے ہیں اس کے ساتھ ہی ناول نگار نے ان عوامی تہذیب وتمدن اور طاقتوں کی نشان دہی کی ہے جو قدیم ایشیا کی تاریخ کو نئی راہ دکھا رہی ہیں

آزادی کے بعد ہند و پاک میں معاشی سیاسی ادبی تعلیمی اور دیگر شعبوں میں تبدیلی رونما ہوئی خاص طور سے ادب کو اس سے کافی نقصان ہوا ظلم وستم فسادات کے شکار لوگ ہجرت کے مصیبت و مسائل سے درچار تھے یہ بہت نازک دور تھا۔یا یوں کہا جائے کہ دستور زباں بندی تھی۔بہر حال اس ہیجانی صورت حال نے عرصہ دراز تک ادیبوں کو ذہنی تعطل کا شکار بنائے رکھا۔یعنی تحریری شکل میں اپنے ذہنی اظہار خیال سے محروم رہا۔آخر کار ایک مدت کے بعد ناول لکھا گیا جو ایک فلسفیانہ اور فکری عمل تھا۔جو انسانی زندگی کے پائیدار حقائق کی مفہوم وتعید کے لیے گہری سماجی بصیرت اور تجزیاتی قوت کا مطالعہ کرتا ہے۔ناول نگار اسی وقت اچھا ناول نگار ہو سکتا ہے۔جب وہ سماج میں رہنے والے انسان کے حالات ومسائل کا بغور مطالعہ کریں گے اس کا جائزہ لیں گے اس کے لیے مصنف کو اپنا قیمتی وقت عرصہ دراز تک لگانا پڑے گا۔بہر حال میں آزادی کے بعد ناول نگاری سے متعلق بات کرنے کے حق میں ہوں جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ اس زمانہ میں عام لوگوں کے علاوہ ادیبوں کے ساتھ کیا دقت اور دشواریاں پیش آئیں کہ خاص طور سے ترقی پسند ادیب ایک موج

خوں سے گزر گیا بعد ازاں حالات سازگار ہوئے تو تخلیقی تحریک میں خوب ناول لکھے گئے انہیں دنوں ترقی پسند ادیبوں نے ہی ناولٹ کو خاص طور سے فروغ دیا۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ مصروفیت کے ساتھ انسان کے پاس وقت کا فقدان ہو جاتا ہے۔ یہی حال اس زمانہ میں بھی ہوا۔ لوگ زیادہ سے زیادہ اپنے کاروبار اور ملازمت میں مصروف رہنے لگے۔ ناول میں قصہ کردار اور سماج کے بڑے اور پیچیدہ مسائل کی بحث ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ناولٹ میں موضوع، مواد اور فضا موجود ہوتی ہے۔ اس چند نتیجہ خیز حقائق کو چند کرداروں کے توسط سے پلاٹ کو سنوارا جا سکتا ہے۔ ماحول اور فضا بنانے کے لیے جزیات اور تفصیلات کی کسی قدر کم ضرورت ہوتی ہے۔ البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ناولٹ افسانہ کے پھیلاؤ اور ناول کے اختصار کی درمیانی صورت ہے۔ اس میں عمل اور وحدت کا تاثر لازمی نہیں بلکہ قصہ کی وحدت اور گہرائی لازمی ہے تاکہ بنیادی باتیں جو کچھ مصنف کہنا چاہتا ہے وہ کہنے میں کامیاب ہو جائے یہی وجہ ہے کہ ناول کے مقابلے میں ناولٹ کی تخلیق کے لیے تخلیقی اور تعمیری لیاقت کی ضرورت ہوتی ہے یہی خاص بات ہے کہ اس عہد میں ناولٹ کو اہم شہرت ملی اس مقصد کے تحت چند افسانہ نگاروں نے اپنی کہانیوں کو طول دینا شروع کیا۔ مثلاً 'ایک چادر میلی سی' بیدی 'دل کی دنیا' عصمت 'چڑھتا سورج' یا خالی ہاتھ ابوالفضل صدیقی 'ایک معمولی لڑکی' بلونت سنگھ 'جگنو اور ستارے' جیلانی بانو 'بے جڑ کے پودے' سہیل عظیم آبادی 'ہارو سنگ سوسائٹی' قرۃ العین حیدر 'بیانات' جوگندر پال موصوف اپنے تخلیقی سفر کی اس منزل پر ہیں جہاں وہ منزل کو گرد ماننے اور غبار کو منزل بنتے ہوئے دیکھنے کا دعوای کر سکتے ہیں۔ ایک لمبی مسافت اور ایک منفرد تخلیقی وجود جس کی تشریح کرنا یا جس کے بارے میں کچھ کہنا یا لکھنا آسان بات نہیں رہی۔ تجربہ مشاہدہ، سانحہ، حادثہ، گرد و پیش کا فاصلہ، مکاں لامکاں مچلتا ہوا ٹھہراو اور محترک سکون، خیال اور بے خیالی اور ایسا ہی بہت کچھ اپنے کو بیک وقت آشکارا کرتا ہے تو جوگندر پال کے ناول کا ہیولیٰ قاری کے آنکھوں کے سامنے ابھرتا ہے مرئی اور غیر مرئی وجود اور عدم وجود ہونے یا نہ ہونے کی حالت کا تصور کرنا اور اسے صفحہ قرطاس پر ناول کی شکل میں اتارنا ہی جوگندر پال کا کارنامہ ہے

کبھی اس نے فقیری اور پیری کو زندگی کا منتہائے مقصود مان لیا ہوگا اور یہ بھی جان لیا ہوگا کہ یہ درد، پستی، قلندری اور پھکڑ پن کی زندگی کی رمزیت کی آخری حدوں کو چھوڑ کر ہی میسر آتا ہے بس یہ کہیں مستعار نہیں ملتا۔ اور اس عرفان کو جوگندر پال نے اپنی تخلیق کی اساس بنایا۔ جوگندر پال بلا شبہ ایک منفرد و مزاج اور صاف اسلوب ناول نگار ہیں اور اردو ناول کے آسمان پر ایک تابناک اور درخشندہ ستارہ بھی۔ جوگندر پال کو پڑھتے وقت قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ ناول نگار کے ساتھ چلتا ہوا اس کو سنتا ہوا زندگی کی ایمائیت، رمزیت، اشاریت کو سمجھتا جا رہا ہے۔ وہ زندگی کی خوبصورتی اور بدصورتی دونوں کو اپنے سامنے عیاں کرتے ہوئے دیکھتا جا رہا ہے اور ایک ایسے شعور اور تحت الشعور کے کرشمے کا عرفان بھی حاصل کر رہا ہے جو اس کے اپنے اندر ہوتے ہوئے بھی اس پر منکشف نہیں تھا۔ جوگندر پال ناول لکھتا ہے، ناول بنتا ہے، داستاں بیان کرتا ہے اور ایک ایسی سحر انگیز فضا پیدا کرتا ہے جس میں صورت حال اور کردار ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر ایک رمزیت زدہ کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جوگندر پال کے ناولوں میں زندہ لوگ مردوں میں بدل جاتے ہیں۔ اور مردے لوگ زندہ ہو اٹھتے ہیں انسان حیوان میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور حیوان انسان کا شعور اور لہجہ اختیار کر لیتے ہیں اور ناول کی کائنات ایک وجدان کے زیر اثر بڑا انوکھا رقص کرنے لگتی ہے۔ محویت جوگندر پال کے ناولوں کی جان ہے اور مسلسل سفر ان کی روح۔

ان کے علاوہ قاضی عبدالستار نے بھی جو چند ناولٹ تحریر کہتے ہیں انہیں پڑھ کر معلوم ہوتا کہ اس دور کے ناولٹ فنی نقطۂ نگاہ سے ناول سے حد درجہ قریب دلکش اور دلچسپ ہی۔ ان کے کردار اور پلاٹ کی تعمیر اور کرداروں کی پیشکش ڈرامائی ہے۔ اس کے علاوہ حالات حاضرہ میں عام انسان سماجی زندگی میں جس کشمکش کے مراحل سے گذر رہے ہیں اس کی عکاسی اس عہد کے ناول کے بجائے ناولٹ میں زیادہ ہوتی ہے۔ قدیم نواب، شرفا، سرمایہ دار طبقہ کا زوال صنفی انقلاب سے پید شدہ نتائج یعنی نئی بیداری عشق و محبت کے نئے تصور۔ جدید و قدیم خاندان یا رواج کا جھگڑا اونچ نیچ اور بڑے چھوٹوں کے مابین محبت کا فقدان انسانی جذبات اور فرماں برداریوں کی خرید و فروخت

اوراس نوعیت کی اور بھی دیگر حقائق کی بے تعصب تصویریں اس عہد کے اردو ناولٹ میں نمایاں نظر آتے ہیں ۔ یہ بات قابل ستائش ہے مگر دوسری طرف ایسے سنجیدہ اور اہم ناول تخلیق ہوئے ہیں جس میں موجودہ دور کے سماجی مسائل کی کشمکش عیاں نظر آرتی ہیں ۔مثلاً 'معصومہ' عصمت چغتائی' سمن' رضیہ سجاد ظہیر' اپنی اپنی صلیب' صالحہ عابد حسین اور ایوان غزل ۔ جیلانی بانو محتاج تعارف نہیں ۔ جیلانی بانو خاتون ناول نگار ہیں اس میدان میں ان کی اپنی ایک شناخت ہے جس کی وجہ سے وہ جانی جاتی ہیں ۔انہوں نے اپنے ناول میں حیدرآبادی کی سرمایہ دارانہ نظام کے زوال کی کہانی تیکھے وتند احساس اور گہرے سماجی شعور کی روشنی میں قلم بند کیا ہے ۔ وہ اس نظام میں ہونے والے ظلم وستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہیں ۔ ساتھ ہی موصوفہ محنت کش دہقانوں کے باغی ذہن اور انقلابی طاقتوں کی وکالت کرتی ہیں جس کی گرج کڑک ،شور، ہنگامہ، آزادی کے بعد سنائی دیتی ہے ۔اور درمیانہ طبقہ کی عورتوں کے بچپن، دوشیزگی ، شباب کا دلچسپ افسانہ اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے ۔مگران کا کردار 'ایوان غزل' کی کائنات سے باہر کم دکھائی دیتا ہے اور جو باہر ہو جاتے ہیں وہ قیصر کی طرح لوٹتے نہیں ہیں کہ اپنے انقلابی لڑائی کی داستان سناسکیں ناول میں کرداروں کی زیادتی کی وجہ سے کہانی پیچیدہ بھی ہوگئی ہے ۔اس کے بعد موصوفہ اپنے مطالع و مشاہدہ کوشش جہتی حکمت عملی ، وسعت نظر، غیر معمولی فہم وادراک، تجربہ، احساس وغیرہ کی بنیاد پر اردو ناول کو چاند اور غزل جیسے دو محبوب اور لازوال کردار خلوص و بے لوث محبت کے ساتھ فراہم کردی ہیں ۔

اس طرح اردو ناول کے پس منظر کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ مجموعی طور پر یہ ترقی پسند نظریہ ادب اور زندگی سے قریب ہے ۔ ہمیشہ سے یہ روایت چلی آرہی ہے رہر دور میں بدلتی ہوئی زندگی کے رشتوں اور ہمت پر غور وفکر اور اس کی معنویت کی کھوج کا ولولہ اور جذبہ انسانی جبلت میں پہناں رہا ہے ۔اس وقت پریم چندتا کا ہی طریقہ مستحکم طور پر رائج رہا ہے جو انسانی زندگی کو خوشگوار بنانے کے ساتھ ترقی کے راستہ پر گامزن کرتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اچھا ناول نگار اپنی حقیقی

تجربات کے پیش نظر صداقت پر مبنی ناول نگاری کرتا ہے اور تاریخ کی صداقتوں کو سماج میں رہنے والے انسانی رشتوں سے جوڑ کر پیش کرتا ہے۔ سماجی زندگی میں جو جو مسائل رونما ہوتے ہیں اس میدان میں داخلی تجربہ ڈرامائی پیشکش اور علامتی اظہار و بیان کے جو تجربے قراۃ العین حیدر نے کیے ہیں۔ وہ اظہر من الشمس ہیں اور ان کی یہی خصوصیت ان کو خاتون ناول نگاروں کا امام بنا دیتی ہے۔ اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ دور میں ترقی پسند ناول ہمارے سماجی مسائل پر مبنی ہے یا نہیں اور اس کے ذریعہ اس کا حل ممکن ہے یا نہیں اس کے بارے میں آپ کا ذہن مبذول کرنا چاہوں گا کہ بیسویں صدی کے چوتھے دہائی کے بعد اردو ناول کا موضوع شہری سماج ہو گیا ہے۔ جب کہ ہندوستان میں اسی فیصد لوگ دیہات میں بستے ہیں۔ وہ مزدور کسان، محنت کش اور معصوم ہیں۔ ان لوگوں کو بڑے بڑے مسائل حادثات و واقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ ایسے ایسے مراحل سے گذرتے ہیں جس کا ذکر آتے ہی کلیجہ تھام لینا پڑتا ہے ایسے لوگوں اور ان کو ناول کا موضوع بنانے سے محروم رکھا ہے۔ بہر حال جب ہم اردو ناول کے ارتقاء کے متعلق بات کریں گے تو معلوم ہوگا کدفی زمانہ اردو ناول کا موضوع اعلی شہری سماج کا حلقہ بن گیا ہے اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اردو ناول نگاری میں ایسے ناول نگاروں کا فقدان ہے جو دیہات کے سماج سے واسطہ رکھتے ہوں۔ ویسے حالات حاضرہ میں معدود چند لوگوں نے دہقان اور اس کے احوال، دیہات اور دیہاتی ماحول پر مبنی ناول تخلیق کی ہے۔ مگر ان حضرات نے دیہات کے محنت کش طبقے کی زندگی کو ایک چشم دہقان سے نہیں بلکہ جاگیردار یا درمیانی طبقہ کی نظر سے دیکھا ہے۔ اس لیے ان کی انسان دوستی محنت کش دہقان سے ان کی سچی محبت اور احساس قرابت کی جگہ ان کی حالت پر کرم یا دردمندی کے جذبات کی چغلخوری یا مخبری کرتی ہے۔ ان حضرات کے ناولوں میں غریب اور محنت کش انسانوں کی مظلومی کی تصویریں تو نظر آتی ہیں۔ مگر ظلم وستم کے خلاف ان کی نفرت ان کا جذبہ بغاوت ان کی روح کا کرب و درد کا سراغ نہیں ملتا۔ بیسویں صدی میں بانو قدسیہ، خدیجہ مستور، ممتاز مفتی، بلونت سنگھ، ایم اسلم اور ابن سعید ویسے بڑے اور چھوٹے ناول نگاروں کا ایک قافلہ پیہم

رواں دواں ہے۔ان ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں تقسیم ہند سے پیدا ہونے والے پیچیدہ سیاسی، اقتصادی، سماجی، آپسی اختلاف نفاق معاشی بدحالی سماجی نابرابری، بے مروتی، ناانصافی، جبر وظلم اور جاگیردارانہ ظلم واستحصال اور جغرافیائی اور ثقافتی وادبی مسائل پر مبنی ناول تخلیق کیے۔تقسیم ہند کے بعد کے بڑے ناول نگاروں نے اس عہد کے حالات کو بڑی فنکاری کے ساتھ قلم بند کیا ہے جہاں وہ لوگ اقدار کے زوال وانہدام کے نوحہ گری کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔جتندر بلّو، ہرچرن چاولہ، انور خان وغیرہ نے انسانی تضاداد، شدید ردعمل ہجرتوں کا سلسلہ اور ان سے متعلقہ معاملات و حالات اور مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔اسی عہد میں بلونت سنگھ، کے ناول شہری عامیانہ پن کے زد کا شکار رہی ہیں۔جمیلہ ہاشمی،، مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں میں دیہات اور شہر کی دوئی اور باہمی ترسیل کا بحران ہے۔سید محمد اشرف کے ناول میں ثقافتی اداروں کے زوال وانتشار اور انسانی غم والم افسردگی اور حرماں نصیبی رقص کرتی ہیں۔جیلانی بانو کے ناولوں میں متعدد قسم کے مرد وعورت کے کردار ملتے ہیں اور دبی زبان میں جنسی معاملات اور عاشقانہ واردات کا تفصیل وتشریح دکھائی دیتے ہیں۔ساجدہ زیدی کھلے انداز میں غیر روایتی جنسی رشتوں کی پیش کش کرتی ہیں۔ریوتی سرن شرما کے ناول کی عورت جہاں رشتہ ازدواج کی حدود کے اندر رہنے کے باوجود اپنی انفرادی شناخت کا حق مانگتی ہے۔اس کے علاوہ بیسویں صدی کو الوداع کہہ کر اکیسویں صدی کو خیر مقدم کرنے والے ناول نگاروں میں نئے اور پرانے چراغوں کا متحرک اور فعال قافلہ ہے جو پیہم ہر گام اپنے منزل مقصود کی جانب رواں دواں ہے جس میں مظہر الزماں، کوثر مظہری، فہمیدہ ریاض اقبال مجید، انور سجاد، عمر او طارق، احمد داود، آغا سہیل، فخر زمان، طارق محمود، خالد سہیل، شام بارک پوری، محسن علی، یعقوب یاور، پروفیسر محمد حسن،، الیاس احمد گدی، غضنفر، گیان سنگھ شاطر، احمد صغیر، وبھوتی نرائن، شام سندر آنند وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جس میں مصنف الیاس احمد گدی نے صوبہ بہار کے شہر 'جھریا' کے ایک چھوٹے سے علاقے کو اپنی نگاہ میں رکھا ہے۔ناول میں 'فائر ایریا' کو بلیغ اشاریہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔اس میں

صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ صنعتی نظام نے استحصال کی جو شکلیں اختیار کیں ہیں اس کی روداد پیش کی گئی ہے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جس طرح الیاس احمد گدی کا ناول ہم عصر صنعتی ترقی کے در پردہ اس مکروہ استحصالی نظام کا مرقع ہے جو طبقاتی معاشرے کا لازمی وصف ہے اور جو اس بات کی بھی غماری کرتا ہے کہ جاگیردارنہ عہد اور انگریزوں کی غلامی سے نجات کا دعویٰ اور صنعتی ترقی کی چمک دمک اس طبقے کے لیے بے سود و بے معنی ہیں۔ 'فائر ایریا' کا موضوع ایک مسلسل ناانصافی اور ایک مسلسل استحصال ہے جسے مصنف نے بچپن سے جوانی تک اپنے آس پاس مسلسل دیکھا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ کول فیلڈ کی اپنی ایک الگ دنیا ہوتی ہے، استحصال کا کرب مزدوروں کے ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن وہ گھٹ گھٹ کر زندگی کا زہر پینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ حق کی آواز بلند ہوتی ہے لیکن وہ اتنی بے رحمی سے دبادی جاتی ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بھوک، مجبوری، لاچاری، بے بسی، غریبی، اور ظلم کا ننگا ناچ روزمرہ کی زندگی کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ الیاس احمد گدی نے اپنے ناول میں اس ماحول کی تصویر پیش کرتے ہوئے جس عمیق تجربے اور مشاہدے کو بروئے کار لاتے ہیں اس کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اس ناول کو لکھنے کا حق صرف اور صرف انہیں ہی حاصل تھا۔ 'فائر ایریا' کا محور جس صنعتی و سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی ہے وہاں کے مزدور سیکٹر کے ٹریڈ یونین کی سیاست کی مختلف شکلیں، اس کے مختلف رخ، جس مہارت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں وہ قابل تعریف ہے الیاس احمد گدی نے ناول کے فن کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا تھا، وہ اس فن کی بوطیقا کو بہت اچھی طرح سمجھ چکے تھے اس خوبی سے کہ فائر ایریا لکھتے ہوئے وہ اس فن کے کسی حصے پر اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کرتے۔ پلاٹ سے کردار نگاری تک اور نظریاتی شعور سے اسلوب بیان تک ہر مرحلہ انہوں نے بے حد فنکاری کے ساتھ طے کیا ہے اور فنی جمالیات کی قدروں سے کہیں بھی روگردانی نہیں کی ہے ایک سچے فنکار کی طرح ان کا خمیر ان کے اردگرد کی حقیقتوں سے تشکیل پاتا تھا اس لیے ان کے یہاں حقیقت پسندی نظریاتی ہے اور ان کے الفاظ طبقاتی احساس و شعور سے لبریز ہونے کے باوجود پڑھنے والے پر معروضی تاثر چھوڑتے ہیں۔ 'فائر ایریا' کے بعض

واقعات مثلاً مجمدار کے قتل کی پلاننگ اور مجمدار کی موت کے بعد ایک جاہل اور گنوار عورت کا جلوس کے ساتھ ساتھ قاتلوں کو پھانسی دینے کا نعرہ لگانے وغیرہ کو بعض حصرات فلمی انداز کا عیب قرار دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ محترم وہاب اشرفی جیسے ناقد نے بھی اسے میلوڈرامائی کیفیت سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ واقعی فائرایریا کے کچھ واقعات خاص کر قتل وخون اور جلسہ و جلوس کے مناظر انتہائی میلوڈرامائی اور ایکدم فلمی انداز لیے ہوئے ہیں لیکن اسے تخیل کی دین سمجھ کر فلمی اور غیر اصلی سمجھ لینا صحیح نہیں کیوں کہ کول فیلڈ میں رہنے والے جانتے ہیں کہ وہ ایسی جگہ ہے جہاں ایسے واقعات دن رات پیش آتے رہتے ہیں۔ عورتوں کا جھنڈا لے کر جلوس میں شامل ہونا ایک عام بات ہے۔ جبر اور استحصال سے قطع نظر بالکل آمنے سامنے صف آرا ہونے کی کیفیت وہاں موجود ہے دوسرے یہ کہ ہماری زندگی پر آج میڈیا کا بے پناہ اثر بالکل واضح ہو گیا ہے اس لیے تخلیقی ادب کو میلوڈرامائی کیفیتوں سے نزدیک رکھنے کو عیب کے بجائے خوبی میں شمار کرنا چاہئے۔ ایسے چند گنے چنے لوگوں میں الیاس صاحب کو آسانی سے رکھا جا سکتا ہے۔ ایسا اس لیے بھی کہ الیاس کہانی کہنے کے فن سے واقف ہیں اور انہیں ماجرا سازی کا ہنر آتا ہے۔ کچھ برس پہلے ہندی کے مشہور کھتا کار رنجور کا ایک ناول شائع ہوا تھا۔ ساودھان ! نیچے آگ ہے،۔۔۔ یہ ناول فائرایریا یعنی کولفیلڈ میں کام کرنے والے ان مزدوروں کی زندگی پر مبنی تھا جو اندر دہک رہی آگ کی بھٹی میں اپنے حال اور مستقبل کو فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ تب خیال آیا تھا یہ ناول غیاث صاحب نے کیوں نہیں لکھا؟ یا اس موضوع پر الیاس صاحب نے قلم کیوں نہیں اٹھایا جب کہ ان کا تعلق اسی فائرایریا سے ہے۔ جہاں اکثر مزدوروں کی زندگی کا سودا ہوتا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے میں الیاس احمد گدی کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ اس بہانے انہوں نے کولیری کی اس دنیا میں جھانکنے کی کوشش کی ہے، جہاں گھٹن ہے، گھپ اندھیرا ہے، کھولتے ہوئے گرم لاوے ہیں۔۔۔۔ اندر آگ ہے اور اس آگ میں گندن کی طرح پیتا ہوا مزدور ہے۔ الیاس نے اس ناول میں کہیں شاعری نہیں کی ہے۔ ماحول دیسا ہی پیش کیا ہے جیسا کولیری کا ہونا چاہئے کرداروں کے مکالمے

ویسے ہی رہنے دیے ہیں جیسا کہ وہ بولتے ہیں۔علاقائی زبان کے علاوہ بہار کی دوسری بول ٹھولی پر بھی الیاس کی گرفت مضبوط ہے۔صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فائر ایریا کی تخلیق وہ شخص کر رہا ہے جو بہار کے جغرافیائی حدود، زبان، ماحول اور کلچر سے بخوبی واقف ہے۔اس واقفیت نے فائر ایریا کو ایک عمدہ اور کامیاب ناول بنا دیا ہے یہ مکمل طور پر ریسرچ کا موضوع تھا ایسے ناول کی تخلیق ہوا میں ممکن نہیں تھی۔

اردو میں آج بچوں کا ادب لکھنے والا کوئی نہیں۔یہ انتہائی افسوس کی بات ہے۔بڑے ادیب بچوں کے لیے لکھنا کسر شان سمجھتے ہیں۔جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بچوں کے لیے لکھنا انتہائی ذمہ داری کا اور مشکل کام ہے۔کہانی انکل کی کہانی بچوں کے گرد گھومتی ہے ایک کہانی انکل ہیں جو کہانیاں سناتے ہیں اور ڈھیر سارے بچے ہیں جو کہانی انکل کو ہر وقت گھیرے رہتے ہیں۔غضنفر کا اپنا ایک منفرد اسلوب۔اور یہ نیا ڈکشن یا اسلوب اس ناول میں بھی نظر آتا ہے یعنی ایسا انوکھا ڈکشن، جس سے بچے اور بڑے دونوں ہی لطف اندوز ہوسکیں اور کہنا چاہیے غضنفر اپنے اس ڈکشن کی دریافت میں کامیاب ہیں۔ہاں ایک بات ضرور ہے کہ کہانی انکل ناول ہے نہیں، ناول بنایا گیا ہے۔اور اس کے لیے بس تھوڑی سی مغز ماری کی گئی ہے۔یعنی کہانی والے انکل اور بچوں کا سہارا لیا گیا ہے۔اس کی زیادہ تر کہانیاں پہلے ہی رسائل و جرائد میں چھپ چکی ہیں ہاں حیرت والی کہانی کا ایک حصہ وکٹر ہیوگو کے مشہور ناول Less miserable کی یاد دلاتا ہے خاص کر یہ حصہ۔اندھا دیکھ رہا تھا، آنکھ والا ٹھوکر کھا رہا تھا لنگڑا دوڑ رہا تھا Less Miserable کا پادری جب اندھوں کی نگری میں پہنچتا ہے تو اس کے ساتھ کم وبیش یہی واقعہ پیش آتا ہے۔

ادب، ادب ہوتا ہے۔ادب میں کشف و کرامت اور معجزے جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی۔مگر جب کبھی گیان سنگھ شاطر جیسی حیرت زدہ کر دینے والی کوئی کتاب سامنے آتی ہے تو اس اکیسویں صدی میں بھی معجزے کا قائل ہونا پڑتا ہے۔یہ ایک سوانحی ناول ہے اور اسے قلم بند کرنے والا فن کار وہ ہے جس نے اپنی شخصیت کی پرتیں کھولنے کے لیے اس زبان کا انتخاب کیا، جس زبان سے وہ خود

بھی انجان تھا لیکن وہ محسوس کرتا تھا کہ جذبات واحساسات کے اظہار کے لیے اردو سے بہتر کوئی دوسرا وسیلہ نہیں۔ حقیقت شناسی کی جس سڑاندھ سے وہ اپنی ذات کے موتی لٹانا چاہتا تھا اس کیلیے صحیح معنوں میں اردو زبان کی Flexibility کی ضرورت تھی۔ اس زبان کی رعنائی، دلکشی، شرینی، روانی، لطافت اس آپ بیتی کو بھرپور صحت اور زندگی بخش سکتا تھا۔ گیان سنگھ شاطر ایک تو سب سے بڑی خوبی مجھے یہ نظر آتی ہے، آنکھیں کھولتے ہی یہ اپنی ذات کے تعاقب میں نکل پڑا۔ اور ایسا لکھا کہ آپ کبھی بھی واقعہ کی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔ ایک فن پارہ کی اس سے زیادہ کامیابی اور کیا ہوگی؟۔ یہ کتاب صرف آپ بیتی تک محدود نہیں ہے شاطر نے اس میں ایک پورا جہان آباد کر رکھا ہے جانا پہچانا بھی اور ان دیکھا سا بھی ایک ماں ہے۔ شفقتوں والی ماں۔۔۔ بیٹے پر اپنی دعاؤں کا سایہ کرنے والی ماں۔۔۔ اپنے شوہر کے سائے سے ڈر جانے والی ماں۔۔۔ اندر ہی اندر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے والی ماں، روایتی زنجیروں میں جکڑی ڈری ڈری سی خوفزدہ سی ماں ۔۔۔ ایک تایا بھی ہیں جو عورت کی عظمت کے قائل ہیں انتہائی فیاض، بردبار، ایک ایسا انسان جو کسی کا بھی آئیڈیل ہوسکتا ہے۔ اور ایک بھائیا جی جو انسانوں سے حیوانوں جیسا اور حیوانوں سے درندوں جیسا سلوک کرتے تھے۔۔۔ تایا جہاں عورت کو تخلیق کا سرچشمہ سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ عورت ہی سرشٹی ہے، وہیں بھائیا جی کی رائے بالکل مختلف ہے وہ کہتے تھے۔۔۔ 'عورت اور کتیا کی نفسیات ایک سی ہے۔ اسے روٹی کپڑا نہ دو اس چڈے سے لپٹے رہو اور تھن چوستے رہو۔ یہی اس کی زندگی ہے اور یہی آسودگی۔' یہ دو غیر معمولی کردار ایسے ہیں، جو اردو ادب کی تاریخ میں اضافہ تو ہیں ہی شاطر کا مقام متعین کرنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ عجیب وغریب کردار تایا جی جہاں ایک آئیڈیل کے طور پر دل ودماغ کے گوشہ میں اپنی جگہ محفوظ کرتے ہیں، وہیں بھائیا جی کی عورتوں کے بارے میں سوچ، بھائیا جی کی گفتگو، ان کا لب ولہجہ۔۔۔ اگر منٹو کے بارے میں کہا جائے کہ اس نے صرف ٹوبہ ٹیک سنگھ دیا ہوتا تب بھی اردو ادب ان کا احسان مند ہوتا۔۔۔ یہی بات ان کرداروں کے حوالے سے کہی جاسکتی ہے ایسے ناقابل فراموش کردار سے گیان سنگھ شاطر اردو

زبان کا دامن وسیع کر گئے ہیں۔ایک طرف جہاں یہ انوکھے کردار ہیں اور شاطر کا بچپن ہے اس کا نسائی حس ہے، اس کی جوانی ہے، جوانی کی ترنگیں ہیں، سرمستیاں ہیں اور مجبوریاں ہیں، وہیں سرزمین پنجاب میں اگی ہوئی وہ حیرانیاں ہیں، جنہیں دیکھنے کی تاب رکھنے والی آنکھیں ہونی چاہئیں اور جسے اپنی مخصوص انداز بیان میں، شاطر نے انوکھا پنجاب بنا دیا ہے۔ بیدی نے اپنے کہانیوں میں جس پنجاب کا چھلکا بھرا تھا، بلونت سنگھ نے جس کی گودے میں پنجابی مردوں کی آن، بان اور شان دیکھنے کی جرأت کی تھی، شاطر نے اس پورے پنجاب کو تہہ در تہہ اس طرح کھول دیا ہے کہ آنکھیں ششدر رہ جاتی ہیں۔

وبھوتی نارائن رائے کا نام اردو حلقے میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔اگر چہ وہ پولیس کے اعلی افسر ہیں۔لیکن بطور ہندی ادیب ان کی شناخت بڑی مستحکم اور معتبر ہے'شہر میں کرفیو'اس کی تازہ ترین پیشکش ہے۔اس سے وبھوتی نرائن رائے کی ایک نہایت اہم تحقیقی کتاب'فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستانی پولیس' منظر عام پر آ چکی ہے، جسے اردو حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔'شہر میں کرفیو' کی اشاعت سب سے پہلے 1987ء میں ہندی زبان میں ہوئی تھی۔اس کے بعد ہندوستان کی اہم زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہوئے۔انگریزی میں بھی اس کا ایڈیشن منظر عام پر آیا۔اردو میں کئی اخبارات ورسائل نے اس ناول کے بعض حصے قسطوں میں میں شائع کیئے لیکن اب اردو میں اس کی اشاعت بھی ہوگئی ہے۔انہوں نے خودنوشت کے طور پر جن حقائق سے پردہ اٹھایا ہے، انھیں پڑھ کر بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف بنیادی طور پر ایک انسان دوست شخصیت ہیں اسی لیے انھوں نے خود فرقہ وارانہ فسادات کے دوران اپنے محکمے کے تعصّبات پیشہ ورانہ خامیوں اور جبر کو اجاگر کرنے میں کسی پس وپیش سے کام نہیں لیا۔وبھوتی نارائن رائے نے اس ناول کی تخلیق کا پس منظر یوں بیان کیا ہے۔

'شہر میں کرفیو ایک مختصر ناول ہے مگر اس کو ضبط تحریر میں
لاتے وقت مجھے بڑی پریشانیوں سے گزرنا پڑا۔اس کے

بہت سے کردار اور واقعات الہ آباد شہر کے ایک چھوٹے
سے مضافاتی محلے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ 1980ء کے
فسادات کے دوران میں ان لوگوں اور ان کے محلے سے
وقف ہوا تھا ان کا دکھ اتنا شدید تھا کہ اس کو لفظوں میں بیان
کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ پھر بھی مجھے بار بار یہ محسوس
ہوا کہ اس کے اظہار کے لیے مناسب الفاظ میرے ذہن
سے پھسلتے جا رہے ہیں۔ میں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا
تھا، اس کو لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ بلاشبہ یہ
بات کہی جا سکتی ہے کہ زبان افکار کا ناقص متبادل ہے۔ اگر
یہ کتاب ایک بھی قاری کو سعیدہ اور دیوی لال کا دکھ محسوس
کرنے کا اہل بنتی ہے یا کسی ایسی دنیا کا خواب دیکھنے کی
تحریک دیتی ہے جس میں کوئی فساد برپا نہ ہوتا ہو یا اس کے
ذریعہ فساد برپا کرنے والے عناصر کے لیے شدید نفرت
پیدا ہوتی ہے تو سمجھوں گا کہ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی'۔

اس شہرہ آفاق ناول میں سماج کے ایک ایسے طبقے کے درد اور کرب کو زبان دی گئی ہے، جسے تعصب اور تنگ نظری نے ہمیشہ دبائے رکھا۔ یہ ناول کرفیو کے دوران سماج کے کمزور اور بے بس لوگوں کی لاچاری اور مجبوری کا ایسا دلدوز منظر پیش کرتا ہے، جسے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس ناول میں فساد بھڑکانے اور اس کا سیاسی استحصال کرنے والے عناصر کو پوری جرأت اور بے باکی کے ساتھ بے نقاب کیا گیا ہے۔ فساد کے دوران امن قائم کرنے کے نام پر پولیس فورس، مظلومین کے ساتھ جبر و استبداد اور تعصب کا جو سلوک روا رکھتی ہے اسے خود اسی محکمے کے ایک اعلیٰ افسر نے فکشن کی زبان میں بڑی چابک دستی اور روانی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس

لیے ناول کی اہمیت دو چند ہوگئی ہے۔ وبھوتی نارائن رائے نے ہندوستانی پولیس کی کارکردگی اور ہندو مسلم فسادات میں پولیس کے رول سے اپنے عملی اور براہ راست واقفیت کے باعث اس ناول کو ایک واضح دستاویزی بنیاد بھی عطا کی ہے۔ ان کا مشاہدہ بہت دوٹوک، کھرا اور پھیلا ہوا ہے۔ ہندو مسلم فسادات جیسے آتش فشاں اور پیچیدہ موضوع پر 'شہر میں کرفیو' کی قسم کا ناول لکھنا آسان نہیں ہے۔ وبھوتی نارائن رائے نے اس ناول میں فکشن نگار کے ساتھ ساتھ ایک مشاہد ایک سماجی مبصر کے رول بھی ادا کے ہیں اور اپنے ہر رول میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کی اس تخلیق کا خطاب صرف ادب کے قاری نہیں ہیں انھوں نے ہمارے زمانے کی معاشرت، سیاست اور سماجی اجتماعی زندگی کی قیادت کرنے والے ان تمام لوگوں سے مکالمہ کیا ہے جن کے ہونے سے یہ زندگی داغدار دکھائی دیتی ہے چنانچہ یہ چھوٹی سی کہانی ایک آئینہ بھی ہے۔ جس کی اپنی سطح تو بہت شفاف ہے، لیکن اس سطح سے جھانکتے ہوئے عکس کو دیکھ کر دل ڈوبنے لگتا ہے۔

شام سندر آنند (قلمی نام آنند لہر) ان کی اب تک 'انحراف' اور تین ناول 'سرحد کے اس پار' 'سرحدوں کے بیچ' اور 'مجھ سے کہا ہوتا' خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ زیر تبصرہ ان کا چوتھا ناول ہے اس کی تخلیقی فضا سرزمین کشمیر پر 1947ء سے 1996ء تک رونما ہونے والی درد بھری داستان سے تیار کی گئی ہے۔ آنند لہر کے دوسرے ناولوں سے بھی کشمیر کے متعلق ان کے درمند دل کی غمازی ہوتی ہے اس ناول میں قبائلیوں اور پٹھانوں کے ذریعے وادی کشمیر کی مجروح ہوتی ہوئی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہاں پوجا اور نماز دونوں کو یکساں اہمیت حاصل ہے اور ہندو مسلم دونوں ایک دوسرے کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اس ناول کا سب سے اہم واقعہ مندر سے شنکھ کا چوری ہوجانا ہے جس سے مندر کا پجاری بدری غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا ہے اور بالآخر وہ ایک ٹریننگ کیمپ میں پناہ لینے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ اس کا دوسرا اہم حصہ وہ ہے جہاں سلیمان کو فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رکھنے کی پاداش میں قتل کردیا جاتا ہے نیز ظلم کے خلاف احتجاج کرنے والی اس کی بیوی ساجدہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اس کے بعد اس کی بیٹی نجمہ

کی عزت بھی محفوظ نہیں رہتی۔اس ناول کو فنی اعتبار سے پرکھنے کی بجائے ناول نگار کے اس ذہنی رویے کو دیکھنے کی ضرورت ہے جس کی بنا پر یہ ناول وجود میں آیا فنکار نے اس ناول کے ذریعہ یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ فکر و عمل سے اس دنیا کو بہتر بنایا جاسکتا ہے اس کا جذبہ یقیناً قابل قدر ہے۔چنانچہ موضوعی اعتبار سے یہ ناول اپنے اندر بڑی کشش رکھتا ہے۔

پچھلے کچھ دنوں سے جدید ذہن کے کئی ناول نگاروں نے اپنی اپنی دلچسپی کے تحت منتخب موضوعات پر ناول نویسی کر کے اردو ناول کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی سعی کی ہے جن میں عبدالصمد، حسین الحق، مشرف عالم ذوقی، پیغام آفاقی، علی امام نقوی، کشمیری لال ذاکر، شموئل احمد، شبرّ امام، تنویر جہاں، علی امام نقوی اور محمد علیم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔علی امام نقوی بہت اچھی نثر لکھتے ہیں۔حالانہ کہ ان کے کچھ ناولوں کو پڑھ کر یہ تاثر فوری طور پر نہیں ابھرتا۔کیونکہ ان کی اکثر ناولوں میں مقامی بولی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ناول کے نثر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے مکالموں میں مقامی رنگ بے روک ٹوک آسکے۔وہ بمبئی کے باہر کے عام متوسط طبقے اور نچلے طبقے کی زندگی اور معاشرت کی بھی بڑی عمدہ عکاسی کرتے ہیں رسم ورواج اور مختلف طبقوں کی اصطلاحات کا حال پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں زندگی اور زندگی کے مظاہر سے کتنی دل چسپی ہے۔عبدالصمد کا ناول مہاتما منظر عام پر آیا تو اس اعتبار سے ناول اور ناول نگار نے ضرور چونکا دیا ان کی تحریروں میں صرف مواد بلکہ پیش کش کی سطح پر بھی شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ناول میں نہ عشق کی پھیلی ہوئی داستان ہے اور نہ ہی تاریخی ناولوں جیسی چمکتی ہوئی تلواریں ہر صفحے سے نمودار ہوتی ہیں بلکہ یہاں آج کی زندگی کے ایسے احول کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں چاہے متوسط طبقہ ہو، اعلی طبقہ ہو یا کسی اور طبقے کے انسانی نسل کی بیداری کی داستان ہو۔اس عہد کو اس نظام سے گزرنا ہی ہوگا جو اس ناول میں بہت فطری انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔یعنی آج کے موجودہ تعلیمی نظام کی گرتی ہوئی صورت حال کے لیے انہوں نے جن کرداروں کو سوالوں کے حصار میں قید کیا ہے ان میں سیاست داں۔والدین۔طلباء۔اساتذہ۔قابل ذکر ہیں۔اس

میں ایک کردار ہے جو فرسٹ کلاس میں ایم اے کرنے کے بعد پروفیسر پرساد سے اپنے مستقبل کے بارے میں باتیں کرتا ہے دو راستے اس کے پیش نظر ہیں۔ایک سول سروس میں جانا اور دوسرا کالج کا ٹیچر ہونا۔شاید راکیش کے ذہن میں کہیں نہ کہیں یہ بات ہی تھی کہ سول سروس میں وہ زیادہ کامیاب ہوسکتا ہے۔اس لیے پروفیسر کے سامنے وہ اپنی بات یوں رکھتا ہے کہ پروفیسر پرساد کا تعلق جس نسل سے ہے اور راکیش جس نئی پود سے تعلق رکھتا ہے دونوں کی فکری جدوجہد میں بہت تبدیلیاں ہوچکی ہیں۔ناول نگار جس سسٹم کی بات راکیش کے حوالے سے کرنا چاہتا ہے ناول کا مرکزی خیال بھی وہی ہے۔ایسے میں جب یہ حادثہ رونما ہوجاتا ہے کہ لیکچرر کے عہدے کے لیے شعبہ سیاسیات میں سب سے اچھی درخواست ہونے کے باوجود راکیش کو اس عہدے کے لیے نہیں چنا جاتا ہے۔عبدالصمد نے اسی موقع پر ایک اسی نسل کے آئیڈیل کردار پروفیسر پرساد کو موت سے ہم کنار کیا۔پروفیسر بھی اس کے لیے صحیح معنوں میں ایک موہوم سی امید تھے۔جب راکیش کی فیلوشپ بھی ختم ہوئی تو آمدنی کا یہ ذریعہ بھی ختم ہوا۔اب کردار میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں ناول نگار نے بہت فطری انداز میں اس کے جدوجہد کو ٹھیک اسی انداز میں بیان کیا ہے جس سے موجودہ عہد کے ایسے اشخاص روزگزرتے ہیں۔کردار کو پینٹ کرتے وقت عبدالصمد نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ وہ بتدریج فطری طور پر بدلے یہاں کچھ بھی تھوپنے یا خواہ مخواہ کی آئیڈیالوجی کی بات نہیں کی گئی ہے۔ناول میں وہ مقام بھی آتا ہے جب راکیش کو یہ احساس ہونے لگا کہ وہ اسی سمندر کی مچھلی ہے۔جہاں سے اسے نکال کر پھینکا گیا تھا۔ایک طرف پروفیسر پرساد کا آئیڈیل کردار مرچکا تھا تو دوسری طرف ڈاکٹر سنہا جیسے لوگ بھی تھے۔اگر کوئی ایسا کردار ابھر کر سامنے نہ آئے تو شاید سوچ اور بھی بے ترتیب ہوکر کوئی تخریبی رخ اختیار کرلے۔راکیش کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔وہ اپنی صلاحیتوں کے باوجود اپنی ڈگری کے بل بوتے پر صحیح مقام حاصل نہیں کرسکا۔ڈاکٹر سنہا نے راکیش کی صلاحیتوں اور اس کی ناکامیوں کو مقصد دیا۔جینے کا مقصد۔لیکن یہاں سے کردار زوال کی منزل کی طرف بڑھنے لگتا ہے جہاں سے اس کا کسی طرح لوٹنا مشکل تھا۔عبدالصمد

نے ناول کے اس موڑ پر آ کر لاشعوری طور پر ایک ایسا اعلان بھی کر دیا ہے جس کا اندازہ قاری کو اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے شعور کی رو میں بہتے ہوئے اچانک راکیش کے آئیڈیل کردار کو پیچھے چھوڑ کر ایک نئے راکیش کے ساتھ بہت آگے نکل چکا ہوتا ہے۔ ناول کئی اعتبار سے دعوت فکر دیتا ہے اور بہت بے باک رویئے کے ساتھ قاری کے سامنے آتا ہے۔

کشمیری لال ذاکر کے 80-70 ناول اور افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ فکشن کا کوئی بھی نقاد اور مورخ ذاکر صاحب کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں مشہور ہیں۔ کشمیری لال ذاکر کا ناول 'اگنی پریکشا' ہماری ان بکھرتی ہوئی تہذیبی اقدار کی نشان وہی کرتا ہے جہاں مشترکہ خاندان اب سمٹ کر نیوکلیر کنبوں میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔ اور اب ان کنبوں میں خاندان کے بوڑھے افراد کے لیے جنھیں آج کی اصلاح میں ہم سینئر سٹیزن کہتے ہیں، کوئی گنجائش نہیں سوائے اس کے کہ وہ مغربی ممالک کی طرح اولڈ ہوم آباد کریں۔ ہمارے ہندوستان کی سات آٹھ سو سال کی مشترکہ تہذیب کے نمائندہ ہیں ان کا شمار اردو کے ممتاز فکشن رائٹرز میں ہوتا ہے۔ ان کا نیا ناول 'اگنی پریکشا' عمر رسیدہ لوگوں کے مسائل پر ہے اس ناول کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے عمر رسیدہ لوگوں کے مسائل کو بہت اچھی طرح سمجھا اور بڑی خوبی سے اپنے ناول میں پیش کیا ہے۔ ہزاروں سال سے ہندوستان میں مشترکہ خاندان کی روایات ہیں۔ اس طرح کے خاندان میں خوبیاں بہت زیادہ ہیں اور خرابیاں بہت کم۔ ایسے خاندانوں میں بزرگوں کو تنہائی کے کرب سے گزرنا نہیں پڑتا ہے پھر ان کے صلاح و مشورے خاندان کے نوجوانوں اور بچوں کے لیے بہت بڑی نعمت ثابت ہوتے ہیں۔ کچھ عرصے سے ہندوستان میں نیوکلیر فیملی پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ جب لڑکوں کی شادی ہو جاتی ہے تو وہ اپنی بیوی کو لے کر الگ گھر میں چلے جاتے ہیں۔ اس طرح کے خاندان میں خوبیاں کم ہیں اور خرابیاں بہت زیادہ۔ جب اولاد ماں باپ کو تنہا چھوڑ کر الگ گھروں میں چلے جاتے ہیں تو ماں باپ کے ذہنی کرب کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ نوجوان لڑکے لڑکیوں کے بھٹکنے کے

امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں۔کشمیری لال ذاکر صاحب نے ان تمام مسائل کی طرف بڑی خوبی سے توجہ دلائی ہے۔ میں مشترکہ خاندان کے سلسلے میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں مشترکہ خاندان کے ساتھ ساتھ سماج، روایات اور کلچر کی بہت زیادہ اہمیت رہی ہے۔آج وہ قدریں شکست رویخت کی زد میں ہیں۔اس وقت مغربی دنیا کا سب سے بڑا بحران یہ ہے کہ وہاں انسانی رشتے ٹوٹ رہے ہیں۔نوجوان اپنے والدین کا بالکل خیال نہیں کرتے جب ماں باپ ریٹائر ہو جاتے ہیں انھیں اولڈ ایج ہوم میں بھیج دیتے ہیں اور سال میں ایک دو دفعہ ان سے ملاقات کے لیے آتے ہیں۔شبر امام نے کئی برس قبل اپنے سماجی اصلاح کے نقطۂ نگاہ سے تاریخی اور اصلاحی ناولوں کا سلسلہ شروع کیا۔حب الوطنی کسانوں اور مزدوروں کا استحصال،غریبی امیری کی آویزش، راست بازی، اولوالعزمی، بلند اخلاقی اور انسانیت نوازی موصوف کے ناولوں کے موضوعات ہیں، ان کے ناولوں میں مشترکہ کلچر، ہندو مسلم اتحاد اور قومی یک جہتی کی کامیاب، جھلکیاں ملتی ہے۔مشہور ناول نگار بیمنگ دے کا قول ہے کہ اصل تخلیق کار زندہ اور دیکھے بھالے افراد کو ہی اپنے ناول کے کردار کے طور پر چنتا ہے بیمنگ دے کو خیالی کردار کے وجود سے انحراف ہے۔شبر امام کے ناولوں کے کردار بھی اکثر ایسے ہی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو ہمارے شناسا ہیں وہ کہیں سے ایک قصہ شروع کر دیتے ہیں اور اپنی حکمت عملی سے فنکارانہ رنگ میں پرو دیتے ہیں۔ موصوف کا تعلق دیہی ماحول سے ہے اور وہ 'فائر ایریا' کے مصنف الیاس احمد گدی کی طرح دہقانوں کی حالت زار کو بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں شبر امام کا ایک ناول 'شاہین' 1994ء میں شائع ہو چکا ہے 'جب گاؤں جاگے' ان کا دوسرا شاہکار ناول ہے۔مجموعی طور پر یہ ناول دیہی زندگی کے پیچ وخم،شکست وفتح،تخریب وتعمیر،تضاد وتصادم،آویزش وآمیزش،انقلابات وحادثات،ظلم و جور،آہ وفغاں، کساد بازاری، دہشت گردی، جاگیرداری، رسم ورواج سے منور ومعمور ہے۔ساتھ ہی ناول میں مصنف نے دیہاتوں کی نئی بیداری، اصلاح اور حقیقی ترقی کے لیے توازن کے ساتھ جستجو کرنے کی بات کہی ہے۔تاکہ یہ ملک ہر عہد میں ہر محاذ پر ترقی وتعمیر، امن وامان کی تاویل و

تشریح کے لیے عالم گیر پیمانے پر خود کو پیش کر سکے اور باعث فخر بن سکے۔ مصنف نے جس عظیم مقصد کے تحت یہ ناول لکھا ہے، اس مقصد میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔ اس ناول کے ذریعہ انہوں نے تقسیم وطن اور اس کے نتیجے کے طور پر پیدا ہونے والی المناک صورت حال کو قلم بند کر کے اردو فکشن کے خزانے میں قابل تحسین اضافہ کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک دلچسپ سیکولر اقدار پر مبنی معاشرتی ناول ہے۔ شموئل احمد بھی کئی ناول کے مصنف ہیں۔ ناول نگاری کی دنیا میں موصوف لوہا منوا چکے ہیں ان کا ناول 'مہاماری' کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ریاست بہار میں ہو رہی سیاسی بدعنوانی سیاسی معاشی مفاد پرستی اور دفتری امور کے چولی دامن کا رشتہ، چور بازاروں میں نوکر شاہوں اور سیاسی آقاؤں کی برابر کی شرکت اور گورکھ دھندوں کے احتجاج میں شموئل کا تخلیقی ذہن رقص کناں ہے کہانی کی ترتیب و تنظیم صوبہ بہار کے سیاسی منظر نامے کے پس منظر میں کی گئی ہے۔ اس لیے بیان کردہ تمام واقعات و معاملات کا اطلاق بہ ظاہر تو صوبہ بہار کی سیاسی سرگرمیوں پر ہوتا نظر آتا ہے۔ لیکن جس قسم کی سیاسی داؤ پیچ کی رنگ آمیزی اس ناول کے کینوس پر کی گئی ہے اس سے پورے ملک کا سیاسی نقشہ ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ یہ تخلیقی طریقہ کار شموئل احمد کے عمومیت پسندانہ ذہنی رجحان کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ ناول کے ابتدائی مکالموں سے ناول نگار کے فکری موقف کی وضاحت تو ہوتی ہی ہے ساتھ ہی ساتھ سیاست کے مفاد پرستانہ رویئے اور انحطاط پذیر سماجی قدروں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ زندگی اور سماج کے ہر ان زخموں پر نشتر زنی کرتی ہے جو ناسور بن چکے ہیں۔ منوواد، برہمن واد اور جاتی پرتھا کے حوالے سے بھی جو گفتگو ناول نگار نے کی ہے اس میں بھی فکر و نظر کا یہی رویہ کارفرما نظر آتا ہے۔ یعنی بعض سیاسی اور سماجی تحفظات کے پیش نظر ان کی گمراہ کن تعبیر و تفسیر پیش کرنے کی مذموم کوششیں، ان نام نہاد دانشوروں کی دانشوری پر ایک سوالہ نشان لگاتی نظر آرہی ہیں۔ 'ندی' شموئل احمد کا ناولٹ ہے یہ عورت اور مرد کے درمیان جذباتی، نفسیاتی اور بلا آخر روحانی آویزش کی کہانی ہے یہ کہانی ایک ایسے ماحول کی عکاسی کرتی ہے جس میں ارمان اور بے حسی کے تصادم سے پیدا ہونے والی پریشان و پشیمان صورت حال افسانوی شکل

اختیار کرتی ہے۔ کہانی میں ایک لڑکی اور ایک مرد ہے۔ مرد لڑکی کو حاصل کرنا چاہتا ہے وہ ایک بے محابا جست لگا کر لڑکی کو سڑک پر بھاگتی کار کے نیچے آجانے سے بچاتا ہے۔ لڑکی اس والہانہ جست کو مردانگی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت مان کر اس سے شادی کر لیتی ہے۔ وہ مرد ایک خاص ضابطہ حیات کا غلام نکلتا ہے اس کیلیے اس ضابطے کا حرف بہ حرف پابند رہنا ہی زندگی کا نصب العین ہے۔ اس کے جذبات بھی ایک خاص وقت کے پابند ہیں۔ اس وقت کے گزرتے ہی وہ بے حس ہو کر رہ جاتا ہے، اور وقت پر جاگنا، وقت پر سونا، وقت پر کھانا، حتیٰ کہ وقت پر بوٹ پالش کرنا ہی اس کی زندگی کا مدعا بن جاتا ہے۔ وقت کے خاص حصے میں ہی وہ اپنے اصول کے مطابق لڑکی کی طرف راغب ہوتا ہے اور اسے بھی دیگر اشیا کی طرح بڑے میکانکی انداز میں برتتا ہے لڑکی کے جذبات اس کے ارمان، اس کی جنسی خواہشات کی بیداری اور اس کی قدرتی مناظر اور جنسی حس کے درمیان ہم رشتگی سے لطف اندوز ہونے کی تمنا ہے لیکن مرد کو اس کی رتی بھر پروا نہیں۔ وہ ایک خاص ترتیب کا نوکر ہے اور اگر لڑکی اس ترتیب میں فٹ بیٹھتی ہے تبھی اس کے ساتھ اس کا سروکار ہے ورنہ نہیں۔ مرد کے جذبات کا پتھریلا پن اور بے حسی لڑکی کے وفور جذبات سے ٹکراتا چلا جاتا ہے اور بالآخران کی رفاقت ختم ہو جاتی ہے جسمانی اور جنسی تلذذ کی کمیابی خودکشی کرنے پر مجبور ہو جانے کا المیہ شموئل احمد کا کمال ہے موضوع کے چناؤ میں نہیں بلکہ موضوع کے ساتھ زبان، بیان، اسلوب، تکنیک، احساس، نفسیات اور مردانگی اور نسائیت کی سطح پر انصاف کرنے میں ہے۔ اس ناولٹ کا سب سے بڑا وصف کہانی کا ایک زندہ اور ٹھوس پیکر میں ڈھلتے چلے جانا ہے قصے میں کوئی جھول نہیں ہے اور وہ بالآخر عورت کے روحانی کرب کا استفادہ بن کر قاری کو پریشان کرنے میں کامیاب ہو کر قلم کار کے لیے داد وصول کر کے چھوڑتا ہے۔ یہ ناولٹ قاری کے احساس کے تاروں کو مرتعش کرنے میں کامیاب ہے اور اس کے تجسس کو تازیانہ لگاتا چلا جاتا ہے۔

افسانوی ادب میں مشرف عالم ذوقی اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی تخلیقات کو عام زندگی کی حقیقتوں، نفسیاتی کیفیتوں اور پرانی قدروں سے نئی قدروں کے تصادم کے موقعوں سے

سجاتے ہیں ۔ان کے نئے ناول ذبح میں بھی ان کی تحریروں کی یہ خوبیاں اور خصوصیات موجود ہیں۔ذوقی نے اس چھوٹے سے ناول کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے، یہ ہیں دوپہر،شام، کچھ اپنی کچھ فلک کی (تاریخ)،صبح اور گردش ماہ وسال'دوپہر' میں مسلمانوں کی حالت زار کا خاکہ پیش کیا ہے ۔جن کرداروں کا تعارف کرایا گیا ہے ۔وہ حقیقی زندگی میں بالخصوص قصبات اور ہندو مسلم بستیوں کی زندگی میں چلتے پھرتے دیکھے جاسکتے ہیں۔ان کرداروں میں جو گفتگو ہوتی ہے اس سے عام مسلمانوں کی فکری اور معاشرتی پسماندگی پر روشنی پڑتی ہے۔'شام' میں مسلم سماج کی کشمکش اپنی پوری ہیبت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔'کچھ اپنی کچھ فلک کی' میں قائم زمین داروں سے پہلے اور بعد کے حالات کا بیان کیا گیا ہے۔'صبح' میں مسلم سماج کی حسرتوں کی عکاسی کی گئی ہے اور'گردش ماہ وسال' میں عزم اور ارادے کے استحکام کی جھلک صاف نظر آتی ہے،مگر یہ عزم منفی ہے،اگر کچھ مثبت ہے تو صرف وہ کشمکش ہے جو معاشرے میں پائی جاتی ہے ۔یہی وہ کشمکش ہے جو غلامی، استحصال اور افلاس کی کوکھ سے جنمی ہے اور'ہم تیار نہیں ہیں اس طرح بار بار ذبح ہونے کے لیے۔' کا اعلان کرواتی ہے۔جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے کہ موصوف متعدد ناول تخلیق کر چکے ہیں'پوکے مان کی دنیا' مشرف عالم ذوقی کا تازہ ترین ناول ہے۔اس ناول پر تسنیم فاطمہ ماہنامہ آج کل شمارہ 4 نومبر 2005ء کے صفحہ 44 پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں پچھلے چند برسوں میں جتنے بھی ناول میرے مطالعہ میں آئے ہیں مشرف عالم ذوقی کا ناول'پوکے مان کی دنیا' ان سب میں انوکھا لگتا ہے۔جیسی تیزی ذوقی کے مزاج اور فن میں ہے،ویسی ہی ان کی زبان اور بیان میں بھی ہے۔ عام بول چال کی زبان کو انہوں نے بڑے سلیقہ اور ہنر سے استعمال کیا ہے ۔موضوع کے اعتبار سے یہ مکمل ناول ہے۔مصنف نے آج کی تہذیب پر گہرا طنز کیا ہے۔آج کے بچے تہذیب سے بے نیاز ہیں ذوقی نے اپنے مزاج کے مطابق ناول میں حقیقت کو بیان کیا ہے۔اس ناول میں درد بھی ہے اور درد کا احساس بھی۔انسانی وجود اس دن سے عمل میں آیا ہے جب کہ اس کو بولنا بھی نہیں آتا تھا،اس وقت بھی دو چیزیں اس کے ساتھ تھیں۔ایک بھوک اور دوسرا ایک دوسرے کو جاننے کا

تجسس اور اپنے جذبات کی ترسیل کی خواہش۔خواہ زمانے نے کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لی ہو، کتنے ہی انسانی مدارج کیوں نہ بن گئے ہوں،مگر ترسیل جذبات کی خواہش نہیں بدلی۔اس لیے احساس انسان کے ماحول میں گھٹن محسوس کرتا ہے۔مصنف نے یہی بات ناول کے ہیرو کے حوالے سے کہی ہے۔ناول کا مرکزی کردار سنیل کمار رائے جو کہ ایک جج ہے۔وہ اپنے پیشے کا لبادہ اوڑھ کر جینا نہیں چاہتا۔گھر کے ہر فرد نے یہ بھلا دیا ہے کہ وہ بھی ہماری طرح ہی ایک انسان ہے۔وہ بھی ایک عام انسان کی طرح سوچتا ہے۔اس ناول میں مصنف نے ایک تہذیب کا زوال اور دوسری تہذیب کا عروج بہت خوبصورت انداز میں پرویا ہے۔اسنیہہ اس ناول کی ایک اہم کردار ہے۔ اسنیہہ ماضی کا دامن چھوڑتی گئی اور نئی روایتوں کو اپناتی گئی،مگر سنیل کمار رائے نے کبھی بھی اپنے ماضی سے نظریں نہیں چرائیں۔مشرف عالم ذوقی نے زندگی کے ہر پہلو کو دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ غم سارے رشوں میں گردش کرتا ہے۔دنیا کی رساری خوشی اور سارے غم سب اسی رشتہ کی وجہ سے ہیں،مگر جب یہ رشتہ اپنے معنی بدلتا ہے ان لمحات کو مصنف نے گہری سوجھ بوجھ کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مصنف کی یہ تخلیق ہمارے آج کے معاشرے کے لیے بھی ایک چیلنج کا درجہ رکھتی ہے۔اس میں زندگی کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔کبھی کبھی بچوں کے بے بنیاد سوالوں کے جواب اور بے مقصد باتوں میں بھی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ناول میں غضب کا سسپنس ہے۔سنیل کمار اخلاقیات کے گڑھے میں پھنسے ہوئے ہیں جب کہ نکھل نے وقت کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں کھینچی ہے۔اس لیے وہ ہر لمحے کو جیتا ہے اور نئے زمانے کی تہذیب کو پوری طرح اپنا چکا ہے، مگر سنیل کمار رائے کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی روایتوں کا،تہذیبوں کا خون ہوتے ہوئے دیکھے۔آج کی مشکل ترین زندگی اور بے باک تہذیب کا منظر اس ناول میں بے لاگ پیش کیا گیا ہے۔کہانی پہلے صفحہ سے ہی آپ کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔بارہ سال کا ایک بچہ جس نے اپنی ہم عمر لڑکی کا بلاتکار کیا ہے۔فرد سے سماج،معاشرہ،سماجیات اور پھر ننگی سیاست کی گھتیاں ایک کے

بعد ایک کھلتی چلی جاتی ہیں۔ دراصل یہ ہماری بدلی ہوئی ایشائی تہذیب کا دردناک منظر ہے، جہاں مغربی طرز پر چلتے ہوئے ہم اپنی تہذیبی وراثت کو فراموش کر چکے ہیں دیکھنے والی بات یہ ہے کہ اس تمام جنگ کے پس منظر میں ایک چھوٹا سا بچہ ہے دراصل کہانی کا اختتام ناول کا سب سے خوبصورت حصہ ہے۔ ناول کا اس سے خوبصورت اور چونکانے والا اختتام ممکن ہی نہیں تھا اور دلچسپ بات یہ کہ سارا Trial، سارا مقدمہ ایک خواب میں چلتا ہے اور یہ 'ٹرائل' اس وقت کے انتظامیہ کی بے بسی کا مذاق اڑانے کے لیے کافی ہے۔ ایک طرف بھیانک Reality ہے، تو دوسری طرف Fantasy۔ بچہ ایک، بھیانک Reality سے گزر چکا ہے۔ دوسری طرف وہ پوکے مان سے کھیلتا ہے۔ یہ الجھاؤ ذہن کو کئی سوال دیتا ہے۔ ان سوال و جواب کی کشمکش کا انجام بھیانک ہے۔ بکھرتے ہوئے رشتے، ٹوٹتے ہوئے انسان اپنی ہی لاشوں کو کندھوں پر ڈھوتے نظر آتے ہیں۔ ناول کی مجموعی فضاء، مطالعہ کے دوران ہمیں ایک ایسی دنیا میں لے جاتی ہے، جو ہمارے رہنے جینے کے باوجود ہماری دیکھی ہوئی نہیں تھی۔ اردو کے مشہور دانشور وادیب آل احمد سرور آج کل شمارہ 7 فروری 1990ء کے صفحہ 45 پر پیغام آفاقی کے ناول 'مکان' پر تبصرہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں رقم طراز ہیں۔

'ناول مکان مجھے کئی وجوہ سے پسند آیا۔ یہ عام ناولوں سے مختلف ہے۔ مصنف نے جو موضوع لیا ہے وہ آج کل کے آشوب کا مظہر ہے، مگر اس کو برتنے میں مصنف نے بلندی اور گہرائی دونوں کو چھولیا ہے۔ اس ناول میں جو نفسیاتی اور فلسفیانہ گہرائی ہے، وہ اس ناول کو عام ناولوں سے ممتاز کرتی ہے کہانی تو سیدھی سادی ہے، مگر اس کے ارتقا میں نیرا، کمار، اشوک، الوک، انکل، سونیا کے یہاں جو اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔، وہی اس ناول کی جان ہیں۔ کہیں کہیں کرداروں کی سوچوں میں تکرار محسوس ہوتی ہے۔

شاید یہ عمل ناگزیر ہو۔ موجودہ زندگی کی پیچیدگی، تضادات، اخلاقی قدروں کا زوال، بڑھتی ہوئی کرپشن اور اس کے اثر سے تمام اعلیٰ قدروں کا زوال۔ یہ باتیں بہت کھل کر سامنے آجاتی ہیں۔ بڑی

چیز،ان سب کے باوجود،مصنف کا زندگی کے ثبات اور انسان کی روح پر اعتماد ہے۔جو پورے ناول کو ایک مجاہدہ (Crusade) بنا دیتا ہے۔جس میں مکان کو محفوظ رکھنے کی جدوجہد انسانیت کی بقا کی ایک سعی بن جاتی ہے۔کچھ کرداروں یعنی آلوک کا بک جانا اور اشوک کے یہاں آخری تبدیلی۔ ان کے لیے قاری کو پہلے سے تیار نہیں کیا گیا۔کم سے کم میرا تاثر یہی ہے۔یہ تبدیلی اچانک ہوئی ہے۔ناول نگار کی حیثیت سے تنویر جہاں کا نام محتاج تعارف نہیں۔انھوں نے انسانی زندگی کی فلاح و بہبودی اور معاشرتی اصلاح پر مبنی کئی ناول لکھے ہیں۔ساتھ ہی انھوں نے چند مغربی ناول نگار کے ناول انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔'عوام کا نمائندہ' مصنف چھنوا اچیبے تنویر جہاں کا اسی ضمن کا ناول ہے اس ناول میں ہمیں اپنی کہانی نظر آتی ہے۔اقتدار حاصل کرنے کے لیے سیاسی جوڑ توڑ اور اقتدار حاصل کرنے کے بعد ذاتی مفادات کا حصول۔ان مقاصد کے راستے میں آنے والی رکاوٹ کو دور کرنے گھٹیا سے گھٹیا حربے کا استعمال کر کے اپنے آپ کو بہت زیادہ ملوث کر لیا ہے اور اب پیش آنے والے واقعات کو ناول کے مرکزی کردار نے اپنے ملک کی تاریخ بنا دیا ہے یہی اس ناول کی خوبی ہے۔عام طور پر سیاسی ناول ایک قسم کی دستاویزی فلم بن جاتی ہے اس کے لیے کہا جاتا ہے کہ سیاسی ناول لکھنا بہت مشکل کام ہے لیکن اچے بے اس تنے ہوئے رسے پر سے نہایت آسانی کے ساتھ گزر گیا ہے۔عوامی لیڈر نانگا کے ساتھ اس کا تعلق نانگا کی ہونے والی دوسری بیوی کے ساتھ اس کا ربط وضبط اپنے والد کے ساتھ اس کا رویہ اپنی دوست نرس کے ساتھ رات گزارنے کی کوشش اور نانگا کی طرف سے نرس کو اپنانے کی سازش اور پھر نوجوان سیاسی لیڈر میکس کی سیاسی شکست، یہ سب واقعات نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔اس ناول میں اچے بے اپنے ملک یا کسی افریقی یا ایشیائی ملک کے سیاستدان کے چہرے پر سے ہی نقاب نہیں اٹھاتا بلکہ ان ملکوں کے عام آدمی کی ذہنیت کا بھانڈہ بھی پھوڑتا ہے اگر سیاستدان بے ایمانی، بددیانتی اور فریب دہی کرتے ہیں تو عام آدمی بھی اپنی سادہ لوحی یا خودغرضی کی بنا پر انہیں امداد و تعاون فراہم کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ناول کا مرکزی کردار اوڈیلی کی زبان سے اچے بے کہتا ہے۔'اگر ہم کہتے ہیں کہ نانگا

جیسے انسان جو غربت اور بے قدری سے اٹھ کر اعلیٰ مقام تک پہنچتا ہے، تھوری ترکیب اور کوشش کے بعد اس بات پر آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ سب کچھ تج دے تو اسے انسانی سرشت سے لاعلمی ہی کہی جائے گی جو آدمی بارش میں بھیگتا اندر آیا ہے اور اس نے اپنے آپ کو خشک کیا ہے۔ اس شخص کے مقابلے میں جو اندر بیٹھا ہے دوبارہ بارش میں جانے پر راضی نہیں ہوگا۔ اور ہم میں سے کوئی بھی ایک زمانہ سے اندر نہیں بیٹھا کہ وہ کہہ سکے' جہنم میں جائے سب کچھ'۔ اس فلسفہ سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن جس مقصد کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اسے (چند شخصیات کو) جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا۔ ناول میں فتح آخر کار بدمعاشی اور بددیانتی کی ہوتی ہے اور غیبت پسند اور آورش وادی میکس سیاست کی قربان گاہ پر اپنی جان نچھاور کرتا ہے لیکن جنگ یہاں ختم نہیں ہوتی جاری رہتی ہے اور آخر میں اور ذبلی کہتا ہے۔ 'ایسے نظام حکومت میں ایک انسان اس وقت اچھی موت مرتا ہے جب اس کی زندگی کسی دوسرے شخص کو اتنا متاثر کر دے کہ وہ لالچ کے بغیر اس کے قاتل کے سینے میں گولیاں پیوست کر دے، اچے بے 1930 میں نائیجیریا کے قبیلے ایبو میں پیدا ہوا۔ نائیجیریا کے عیسائی قبیلے پڑھے لکھے اور خوش حال تھے۔ اس نے نائیجیریا کی یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ پھر ایک طباعتی ادارے کا ڈائرکٹر بن گیا۔ 1961 میں سے 1966 تک ریڈیو کا ڈائرکٹر رہا۔ ناولوں کی شہرت کے بعد امریکہ کی میساچوسٹس یونی ورسٹی میں استاد بن گیا۔ وہاں سے امریکی ریاست کنکٹی کٹ یونیورسٹی میں چلا گیا جہاں وہ 1976ء تک رہا وہاں سے واپس نائیجیریا آیا اور این سوکا یونی ورسٹی میں ادب کا پروفیسر ہو گیا۔

آج کل وہ نائیجیریا اور این سوکا و یونی ورسٹیوں میں پڑھاتا ہے۔ بیس سال تک اس نے کوئی ناول نہیں لکھا تھا۔ 1987ء میں اس کا نیا ناول Anthills of Savanah شائع ہوا ہے۔ دنیا بھر کے نقادوں نے اس ناول کو بہت پسند کیا ہے۔ اب ایک دو باتیں ترجمے کے بارے میں بھی ہو جائیں تنویر جہاں نے اس ناول کا ترجمہ کیا ہے۔ ان کی یہ پہلی کوشش ہے اس اعتبار سے وہ واقعی کامیاب ہیں۔ افریقی ادیبوں کا ترجمہ کرتے ہوئے ایک مشکل ضرور پیش آتی ہے۔ یہ لوگ

بگڑی یا بگاڑی ہوئی انگریزی (Pidgin English) لکھتے ہیں، خاص طور سے مکالموں میں اس کا بہت استعمال کرتے ہیں اصولی طور پر تو اس کا ترجمہ کیا ہی نہیں جا سکتا لیکن تنویر جہاں نے اس کا ترجمہ کر دیا ہے۔ بری ہمت ہے ان کی البتہ گیتوں کا وہ ترجمہ نہیں کر سکیں جو افریقی معاشرے کو سمجھنے کے لیے ضروری تھے۔ بہر حال ترجمہ مجموعی طور پر اچھا ہے۔ محمد علیم کے ناول 'میرے نالوں کی گمشدہ آواز' میں جو گاؤں ہمیں ملتا ہے، وہ جیتا، جاگتا، کھاتا، پیتا دکھوں سے لبریز اور خوشیوں سے معمولی آشنائی والا گاؤں ہے۔ اس میں دوستی دشمنی کے ساتھ عیاشی، چوری، ڈکیتیاں، اسمگلنگ اور ذرا ذرا سی بات پر جان سے مار دینے کی دھمکیاں ہی نہیں ملتیں بلکہ جان سے مار بھی دیا جاتا ہے اور یہ منظر نامہ محض ناول میں بسنے والے گاؤں کا ہی نہیں آج ہندوستان کے بیشتر قصبوں اور شہروں کے ساتھ گاؤں کا بھی مسئلہ ہے۔ ناول کے گاؤں سے گزرتے ہوئے کبھی راہی معصوم رضا کے 'آدھا گاؤں' کی تعزیہ داری اور سوز خوانی کان میں پڑتی ہے کبھی عبدل بسم اللہ کی 'جھینی، جھینی، بینی چدریا' کا سایہ ذہن پر منڈلانے لگتا ہے۔

ناول کی خوبی یہ ہے کہ اس میں زندگی کرنے والے افراد کی ایک ایک حرکت، ایک ایک دھڑکن پر ناول نگار کی نظر اور پکڑ ہے۔ ناول نگار نے اپنی بھرپور تخلیقی صلاحتیوں اور زوردار مشاہدہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سب کو جیتے جاگتے سچے آدمیوں میں تبدیل کر دیا ہے، ناول نگار جس گلی سے (خواہ وہ ناول میں استعمال کیا گیا گاؤں ہو یا نیپال کی سرحد) گزرا ہے پڑھنے والے کو ساتھ ساتھ لیے پھرا ہے جس سے قاری خود کو اس ماحول کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہی نہیں مختلف کرداروں، جیسے سکھریا کا مفلوج ہونا۔ شبانہ کا اپنی عیاشیوں کے لیے معصوم رخسانہ کا استعمال کرنا جمیل کی خام ذہنی، آمنہ بیگم کی آنکھوں کی دھندلاہٹ شریفن کی فطرت اکرم الدین کی سادگی اور ڈاکٹر نجم الدین کی گروہ بندیاں یہ سب بھوگی ہوئی سی لگتی ہیں۔ ناول کے بعد کا حصہ زیادہ محنت اور دلچسپی سے لکھا گیا ہے اور اسی حصے میں واقعات بھی اتنی جلدی جلدی اور اس کثرت سے نمودار ہوتے ہیں کہ قاری پوری طرح ناول کی گرفت میں چلا جاتا ہے۔ تحریر کی روانی اور سلاست میں اگر

کوئی چیز رکاوٹ بنتی ہے تو وہ علاقائی بولی کا اثر ہے مجموعی اعتبار سے اردو ناول کا ارتقائی سفر تشفی بخش کہا جا سکتا ہے کہ اس نے ہمیشہ بدلتے ہوئے زمانے اور حیات انسانی کی تصویر کشی کی سعی کی ہے۔ آئندہ ابواب میں آغا شاعر کی ناول نگاری گفتگو ہوگی کہ ناول کے اس ارتقائی سفر میں ان کے ناولوں کی عطا کیا ہے۔

آغا شاعر دہلوی کی ناول نگاری

ادب ایک ایسا ساگر ہے جس میں دنیا جہان کے خیالات کے دریا آ کر گرتے ہیں۔ان کا سوتا کہیں پھوٹتا ہے۔ چادر آب کہیں بنتی ہے اور چشمہ کہیں اور جاری ہوتا ہے۔اردو ادب ہر دور میں نشیب وفراز سے گزرتا رہا ہے۔لیکن ہر دور میں شاعروں اور ادیبوں نے اس کے لیے نت نئی راہیں ہموار کی ہیں اور ترقی کے راستے پر اسے گامزن کرتے رہے ہیں۔اس طرح شاعروں اور افسانے کے ناول کی صنف بھی ان ہی کا وشوں کا نتیجہ ہے ناول کے لغوی معنی Novella کے ہیں جو کہ اطالوی زبان کا لفظ ہے جس طرح افسانے کے بارے میں مختلف ناقدین نے اپنی آرا پیش کی ہیں۔اسی طرح اردو ناول میں بھی مختلف ناقدین کی تعریفیں مختلف انداز میں ملتی ہیں ۔ چنانچہ رابن سن کروسو کے غیر فانی مصنف ڈینیل ڈنو نے اس فن کی بنیاد ڈالتے ہوئے دو چیزوں کا خاص طور سے لحاظ کیا ہے ایک تو یہ کہ قصہ حقیقت پر مبنی ہونا چاہیے۔ دوسرا یہ کہ اسے کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق دینا چاہیے۔اس لیے کہ اگر قصہ حقیقت پر مبنی نہیں ہوگا تو جھوٹا ہوگا اور اس کی تصنیف کے ذریعے مصنف جھوٹ بولنے کا عادی ہو جائے گا۔وہ کہتا ہے کہ:

> 'قصہ بنا کر پیش کرنا بہت بڑا جرم ہے یہ اس طرح کی
> دروغ بینی ہے جو آہستہ میں ایک بہت بڑا سراخ کر دیتی
> ہے جس کے ذریعے چھوٹ آہستہ آہستہ داخل ہو کر ایک
> عادت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔'

فیلڈنگ جوانگریزی ناول کے عناصر اربعہ میں سے ہیں یوں رقم طراز ہیں:

'ناول نثر میں ایک طربیہ کہانی ہے۔'

یعنی اس کے نزدیک المیہ کہانی ناول کے موضوع سے باہر ہے۔اس طرح چرڈسن کے اس نقطۂ نظر کو رد کرتا ہے کہ کہانی کی غرض نیکی اور اخلاق کا سدھارنا ہے۔فیلڈنگ اسے ہنسنے اور ہنسانے کا ذریعہ سمجھتا ہے اس لیے وہ اس میں طربیہ کی شرط لگا دیتا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ تعریف بھی نامکمل ہے۔اس کا ایک ہم عصر اسمولٹ اس نئے فن کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

'ناول ایک پھیلی ہوئی بڑی تصویر ہے جس میں ایک مقررہ
پلاٹ کو وضح کرنے کے لیے زندگی کے کردار مختلف
جمایتوں کے ساتھ رکھ کر مختلف پہلوؤں سے دکھائے جاتے
ہیں۔'

یہ تعریف بھی ناکافی ہے اس لیے کہ اس میں سارا زور پلاٹ پر ہے۔چنانچہ انگلستان کی ایک مشہور ادیبہ کلارا ایوز اس فن کی تعریف یوں کرتی ہیں۔

'ناول اس زمانے کی زندگی اور معاشرے کی سچی تصویر ہے
جس زمانے میں لکھی جائے۔'

پروفیسر بیکر نے ناول کے لیے چار شرطیں لازم کر دیں۔قصہ ہو،نثر میں ہو،زندگی کی تصویر ہو اور اس میں ربط و یک رنگی ہو یعنی یہ قصہ نہ صرف نثر میں لکھا گیا ہو بلکہ حقیقت پر مبنی ہو اور کسی خاص نقطۂ نظر یا مقصد کو بھی پیش کرتا ہو۔حقیقت میں ناول وہ صنف ہے جو حقیقت کی عکاسی کرتا ہو۔زندگی کی سچائی کو بیان کرتا ہو۔صنف ناول نے کئی رنگ بدلے ہیں۔کبھی اس نے رومانی شکل اختیار کی تو کبھی تاریخی ناول کی،کبھی عصری ناول کی تو کبھی رزمیہ و سیاحتی،کبھی اسراری اور کبھی نفسیاتی ناول کی۔غرض یہ مختلف رنگ اختیار کرتا رہا اور دور حاضر تک اردو ناول کے ذخیرے کو مالا مال کرتا رہا۔

ناول کے فن کو مکمل کرنے کے لیے جن اجزاء کا ہونا ضروری ہے ان میں قصہ، پلاٹ، کردار، مکالمہ، مناظر فطرت، زمان و مکاں، نظریہ حیات اور اسلوب بیان کو اہمیت حاصل ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی جز کم ہو تو ایسا ناول مکمل ناول نہیں کہلائے گا۔

اردو میں ناول کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہ صنف ادب برائے زندگی کی ترجمانی کرتی ہے۔ جب بھی کوئی ناول نویس لکھتا ہے تو وہ کوئی نئی دنیا اپنی خواہش کے مطابق نہیں بناتا بلکہ وہ ہماری ہی دنیا سے بحث کرتا ہے وہ وہی چیزیں پیش کرتا ہے جن کا ہماری زندگی سے تعلق ہوتا ہے۔ یعنی کہ جس میں دکھ ہو سکھ بھی ہو جنگ بھی ہو صلح بھی ہو موت بھی پیدائش بھی۔ ناول نگار نہ صرف تخلیل میں پرواز کرتا ہے بلکہ اس کے قصے کی بنیاد روزمرہ کی زندگی پر استوار ہوتی ہے۔ کردار بھی ہمارے جیسے گوشت پوست کے انسان ہوتے ہیں۔

ناول ادب کی اہم صنف ہے جو بقول ڈاکٹر سلام سندیلوی ہماری زندگی کی مختلف گتھیوں کو سلجھانے میں مدد دیتی ہے۔ 1 ناول انگری لفظ ہے انگریزی ادب کے ساتھ ہمارے یہاں آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے ادب پر چھا گیا ہے۔ 2 ناول میں پرانے قصوں، افسانوں اور داستانوں کے برعکس انسانی زندگی کا قصہ ہوتا ہے اس لیے اسے موجودہ عہد کا رزمیہ بھی کہا جاتا ہے۔ 3 انگریزی زبان میں ناول کا آغاز اٹھارہویں صدی میں ہو چکا تھا مگر اردو میں اس کا وجود انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہی ممکن ہو سکا۔ مولوی نذیر احمد کی ناول 'مراۃ العروس' کو اردو کا پہلا ناول مانا جاتا ہے جس کی تصنف 1860ء میں ہوئی تھی اردو ناول نگاری کا فن آج اپنے بام عروج پر پہنچ چکا ہے۔ اردو میں کئی ایسے ناول عالم وجود میں آ چکے ہیں جنہیں بقائے دوام حاصل ہو چکا ہے اور انہیں دنیا کے بہترین ناولوں کی صف میں فخر سے رکھا جا سکتا ہے۔ اردو ناول کے فن کو جہاں شرر، سرشار، نذیر احمد اور پریم چند نے پروان چڑھایا وہیں آغا شاعر دہلوی نے بھی اس صنف میں اپنا خون جگر صرف کیا۔ اگرچہ آغا شاعر نے اور لوگوں کے مقابلے بہت بعد میں اس میدان میں قدم رکھا پھر بھی ناول کے ارتقاء میں ان کا تعاون فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان کا یہ تعاون قابل

ستائش ہی نہیں بلکہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

آغا شاعر نے بیسویں صدی کے آغاز میں ناول نگاری شروع کی۔انہوں نے فن اور موضوع دونوں اعتبار سے اس صنف کو مالا مال کیا ہے۔ان کے ناولوں میں فنی دسترس کا احساس بھی ہوتا ہے اور مقصدیت بھی نظر آتی ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں میں خاندانی نزاع کے بنیادی مسائل کو پیش کیا ہے وہ اپنے ناولوں کے ذریعہ تعلیم وتربیت نیز سماجی اخلاقی اور معاشرتی خامیوں کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے ان کے یہاں میں سماج کا جاہل ہونا ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ اگر سماج تعلیم یافتہ ہوگا تو عام لوگ کامیاب زندگی گزار سکیں گے اس کے علاوہ انہوں نے سماج کی کہنہ فرسودہ رسم ورواج کی طرف بھی ذہن کو مبذول کرایا ہے کہ اکثر اس کا انجام پریشان کن اور جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔اس طرح انہوں نے اپنے ناول کے ذریعہ سماج کے اندر خانگی ذمہ داریوں کے احساس کو جگانے کی کوشش کی ہے اور زبردستی شادی کے خطرناک نتائج کو اجاگر کرتے ہوئے تعلیم وتربیت پر کافی زور دیا ہے۔ان کے خیال کے مطابق تعلیم یافتہ سماج اپنے معاشرہ کی گندگی کو اپنے عقل وشعور کے ذریعہ ختم کرسکتا ہے اور اپنی زندگی کو خوشگوار بھی بنا سکتا ہے۔

آغا شاعر دہلوی کے ناولوں میں نئے زمانے اور نئے تقاضے کی پکار سنائی دیتی ہے۔ساتھ ہی حقیقت پسندی اور فنکارانہ روش کا آغاز بھی ان کے ناولوں میں ماحول کا صحیح مشاہدہ اور اس مشاہدہ کا منطقی تجزیہ اور پھر ان دونوں کے ساتھ غور وفکر بھی پایا جاتا ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں میں گھریلو زندگی اور اس کے مسائل اور گھر کی چہار دیواری سے باہر گلی کوچوں، بازاروں، شاہراہوں میں گونجنے والے نعروں کو بھی پیش کیا ہے۔اس صنف میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے ان کے یہاں خالی خولی جذبات نگاری نہیں ملتی بلکہ ان کے خیالات فکر کے تابع نظر آتے ہیں۔انہوں نے اپنے ناولوں میں اپنے رجحانات ومیلانات اور فلسفہ حیات کا عکس پیش کیا ہے۔آغا شاعر کے کردار میں جو نفسیات اور تجزیاتی جھلک ملتی ہے وہ اپنے آپ میں مثال ہے۔ماحول کا اثر انسان کی زندگی پر کیسے پڑتا ہے اسے انہوں نے اپنے ناولوں میں بڑی چابک دستی سے پیش کیا ہے۔اس لیے

آغا شاعر کے ناولوں کو اردو میں جس حد تک نظر انداز کیا گیا ہے غالباً اس حد تک نہیں کرنا چاہیے تھا

آغا شاعر اپنے دور کے نمایاں ناول نگار رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں متوسط طبقہ میں پروان چڑھنے والے لڑکے اور لڑکی کی محبت، نفسیاتی جذباتی زندگی اور وہ ماحول جس میں کہ وہ پروان چڑھتے ہیں۔ اس قدر تکمیل کے ساتھ اور فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ان کی ناول نگاری اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل کر لیتی ہے۔ ان کے یہاں اخلاقی تقاضے اور قدامت پسندی کا سراغ ملتا ہے۔ اس طرح مشرق پسندی کے اعتبار سے آغا شاعر کو اردو ناول نگاری میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

آغا شاعر کے ناولوں میں ہندستانی رنگ نمایاں ہے وہ انگریزی ادب سے بخوبی واقف تھے اس لیے ان کے ناولوں میں مغربی تکنیک اور انداز فکر کا بھی اشارہ ملتا ہے۔ ان کے ناول مشرقی حسن کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں انہوں نے فرد کی زندگی اس کی ذہنی اور جذباتی کیفیتوں کو موضوع بنایا ہے۔ آغا شاعر نے اردو ناول نگاری کے کینوس کو وسیع کیا اور اس سلسلے میں ان کی اہمیت مسلم ہے۔ موصوف اردو ناول کی دنیا میں بے باک اور باغی ناول نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں ان کے ناول خاندانی ٹکراو، بغض، کینہ، کشیدگی اور سماجی روایت سے بغاوت کے حامل ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ دہلی کے روایتی ماحول اور متوسط طبقہ کے معاشرہ میں ایسے اختلافات کے موضوعات پر انہوں نے کھل کر نشتر زنی کی ہے کہ کبھی کبھی ان کی بے باکی حد کو پار کر جاتی ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر وہ حق گوئی سے بھی کام لیتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں زیادہ تر اخلاقی اصلاح بھائی چارگی، اخوت و مروت کے پہلو نمایاں ہیں مگر ان کے ناولوں میں جنس کا پہلو بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اس کی مثال ان کے ناول 'ہیرے کی کنی' ہے اور ہو بھی کیوں نہیں کیا عورت اور مرد کے درمیان جنس ایک فطری جذبہ نہیں۔ روٹی، کپڑا اور مکان کہ بعد انسان شادی کرتا ہے یہ انسان کی چوتھی اور اہم ضرورت ہے۔ پھر اتنے اہم موضوع کو کیوں نظر انداز کر دیا جائے اس طرح آغا شاعر بیسویں صدی کے مقبول ترین ناول نگاروں کی صف میں کھڑے ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں

کے ذریعہ بیسویں صدی کے سماج کے بیشتر مسائل پر بڑی چابک دستی سے قلم اٹھایا ہے۔ان کے ناولوں میں موضوع اور فن دونوں کا تنوع ملتا ہے انہیں کرداری نگاری کا بھی بڑا سلیقہ آتا ہے۔ان کے ناولوں میں انسان کے نازک احساسات وجذبات، پیچیدگی اور الجھاؤ کی زد میں ہے ان کے علاوہ موجودہ دور میں آغا شاعر کہ بعد بہت سے نام ہیں جو اردو ناول نگاری کے افق پر ستاروں کی مانند اپنی بھرپور چمک دمک کے ساتھ موجود ہیں۔غرض یہ کہ ناول نگاری اور ناول نگاروں کا ایک کارواں سا نظر آتا ہے جو اپنی منزل کی جانب بڑی تیزی سے رواں دواں ہے ان ناولوں میں عہد حاضر کی منتشر اور مضطرب زندگی کے احوال کے ساتھ ساتھ ایک خوشگوار زندگی کا خواب بھی پنہاں ہے۔اس میں حسن اخلاق اور حسن عمل پر بھی زور دیا گیا ہے اور بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ہم آہنگی کا درس بھی ملتا ہے جو موجودہ دور کے ناول کا سب سے بڑا امتیاز ہے۔ان ناول نگاروں نے موضوعات کی رنگارنگی اور وسعت کے ساتھ ساتھ اردو ناول کو دلچسپی اور دلنشینی سے بھی ہم کنار کیا ہے۔اردو ادب کے مشہور ناقد وقار عظیم نے بھی اس کی حمایت کی ہے۔

آغا شاعر دہلوی کی ناول نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ ایوان اردو شمارہ 5 ستمبر 2002 صفحہ 32 پر یوں رقم طراز ہیں۔

> 'آغا صاحب کے ناولوں میں نثر نگاری دلکش اور معتدل ہے موسم کی مرقع کشی فردوس گوش و نظر ہے ۔ بیانات ضروری اور مختصر ہیں ، مکالمے فطری ، دلچسپ، برمحل اور برجستہ ہیں ۔ناول میں ڈرامائی انداز کافی ہے۔عشق وہی رسمی ہے لیکن قصے میں واقعیت کم تخلیقیت زیادہ ہے ۔'

ڈاکٹر سہیل بخاری آغا شاعر کی ناول نگاری پر تبصرہ کرتے ہیں کہ:

> 'ان کی زبان ٹکسالی، پاکیزہ، شستہ اور رنگین ہے۔اس پر روزمرہ محاورے خصوصاً بیگماتی زبان پر بڑی قدرت ہے'۔

شاعر صاحب نے ڈرامہ نگار کی حیثیت سے بھی اپنا سکہ
جمالیا۔ تمثیل نگاری اور ڈرامہ نگاری میں مقبول زمانہ
کہلائے۔'

غرض یہ کہ فن، مواد، موضوع، اور اسلوب ہر اعتبار سے آغا شاعر کی ناول نگاری نہ صرف قابل ستائش ہے بلکہ نا قابل فراموش بھی ہے جسے ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ انہوں نے مسلمانوں کی نا اتفاقی اور نزاع، خستہ حالت، غفلت پر مبنی 'ارمان' اور ناہید جیسے عمدہ ناول لکھے اور 'ہیرے کی کنی' شعور کے رو پر مبنی تخلیق کی ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں اسلامی سوسائٹی، خاندان کی اندرونی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے۔ ان کے ناولوں میں کردار صفات کے مطابق ہوتے ہیں۔ آغا شاعر یوں تو اردو ادب کی مختلف اصناف میں مہارت رکھتے ہیں مگر سب سے پہلے وہ ناول نگار ہیں۔ اخلاقی اصلاح تعلیم اخوت و مروت ان کے ناول کی بنیاد ہیں۔ ان کے یہاں کردار نگاری اور پلاٹ کی بہتات ہے۔ مکالمے دلچسپ دل کش اور موزوں ہیں۔ آغا شاعر قومی اصلاح کے بہت بڑے حامی تھے۔ ان کے ناول بیسویں صدی عیسوی میں عورت اور مرد دونوں طبقوں میں بے حد مقبول ہوئے جن کا اچھا اخلاقی اثر پڑا۔ آغا شاعر کی تحریروں میں روزمرہ محاورے کی صفائی اور زبان کے دلکشی ملتی ہے۔ آغا شاعر کی زبان دلفریب اور پر کشش ہے ان کا اپنا الگ رنگ ہے اور وہ اسی رنگ میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ بیسویں صدی کے ناول نگاروں میں آغا شاعر منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ویسے ناقدین نے موصوف کو سرے سے نظر انداز کر کے نا انصافی کی ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ اردو ادب میں نفسیاتی ناول کے ارتقاء کو سمجھے تو بغیر اس ایک قدم ابھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یوں تو انہوں نے کل پانچ ناول لکھے ہیں۔ ایک 'طلسمی بدلہ' انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہے۔ 'نقلی تاجدار' ہیرے کی کنی' ارمان' اور ناہید طبع زاد ناول ہیں۔ جو ناول کے فن پر مکمل اترتے ہیں اور اردو ناول میں مقبول بھی ہیں۔ اس بات کی صراحت یوسف سرمست نے بھی اپنی تصنیف بیسویں صدی میں اردو ناول صفحہ 98 کے چوتھے سطر میں کی ہے یہاں یکے بعد دیگرے ان کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ

پیش کیا جاتا ہے۔

'ارمان' آغا شاعر دہلوی کا ناول 'ارمان' اردو ناول کی تاریخ میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اس ناول میں دو کردار 'جولی' اور ناصر کی سچی محبت کو آغا شاعر نے پیش کیا ہے۔ گرچہ 'ارمان' دوسرے دور کا ناول ہے مگر فنی لوازمات کے اعتبار سے اپنے آپ میں مکمل ہے۔ آغا شاعر کے ناولوں کی خشت اول ہے جسے آغا شاعر نے اپنی باریک بینی نکتہ رسی اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس کے سبب 'ارمان' اپنے اصل سے کئی گنا پر لطف اور پر تاثیر ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ناول کو اردو میں نفسیاتی ناول کے اعتبار سے اولین درجہ حاصل ہے۔ 'ارمان' آغا شاعر کا پہلا ناول ہے جو 1900ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ اس کا رنگ حد درجہ رومانی ہے جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے کہ یہ ناول نفسیات بشری پر مبنی ہے۔ پلاٹ کردار نگاری، مکالمے، زبان وادب ہر لحاظ سے دلچسپ اور مقصدی ناول ہے جس کا موضوع ایک خاندانی نزاع کا غمناک اور دردناک نتیجہ ہے۔ ناول 'ارمان' میں آغا شاعر نے یہ ذہن نشین کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ خاندان کے ہر فرد کو متحد ہونا چاہیے۔ ایک دوسرے کے جذبات کی قدر کی جائے۔ والدین اپنی اولاد کی مجبوریوں کو سمجھیں۔ اس کے لیے والدین کو بغض، کینہ، حسد سے دور رہ کر اپنا کردار مثالی بنانا چاہیے

ناول 'ارمان' بائیس مختلف ابواب پر منقسم ہے ہر باب کا تسلسل دوسرے باب سے ہے۔ ہر باب کا اختتام کسی نہ کسی نتیجہ اور انجام پر ہوتا ہے۔ اس ناول میں آغا شاعر نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل کی ہندوستانی مسلم گھرانوں کی روایت کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس زبانہ میں مسلم سماج میں جو رسم رواج عقیدت، مذہبی، سیاسی، اقتصادی، معاشی عیش وعشرت۔ خاندانی نزاع، انانیت، غیروں سے دوستی، اپنوں سے بیر اور خصوصاً مخلوط خاندان کے اندرونی انتشار اور آپسی رنجشوں کو بڑی چابک دستی اور فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے جس میں خاندانی نزاع پر بڑی اچھی کشمکش ملتی ہے۔ پہلے باب کا خلاصہ اس طرح ہے۔

ڈپٹی کمشنر بہادر جنگ نواب بہت بڑے شرفا میں ہیں۔ خدا کا دیا ہوا سب کچھ ہے۔ اپنی پر

مسرت زندگی مع اہل وعیال کے گزارتے ہیں ان کی دو اولاد میں پروفیسر مظہر اور خورشید عالم ہیں۔مظہر اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے پروفیسر ہوئے اور خورشید پرانی دلی کی روایت کے مطابق علم سے ناآشنا رہ جاتے ہیں۔دونوں بھائی شادی شدہ ہیں۔پروفیسر مظہر کی بیوی کا نا حیدری خانم ہے بیٹے کا نام ناصر احمد، محسن وغیرہ ہے۔اس کے برعکس خورشید کی بیوی کا نام امراؤ بیگم اور ایک حور چہرہ بیٹی جوئی ہے۔ڈپٹی کمشنر اور اس کی بیگم اپنے وارثوں کے ساتھ کافی خوش ہیں مگر یہی دارالسرور جہاں خورشید کشمکش حیات میں مبتلا ہے۔کچھ دنوں بعد کمشنر کا انتقال ہو جاتا ہے اور خورشید کس وجہ سے قید و بند کی زندگی گذارنے لگتا ہے اس کی بیوی مغموم رہا کرتی ہے۔جوئی اپنے تمام رشتہ داروں کے درمیان باپ کی غیر موجودگی میں مفلوک الحال رہا کرتی ہے اس برعکس پروفیسر اپنے اہل عیال کے ساتھ پرمسرت زندگی گذارتا ہے۔

اس طرح آغا شاعر نے پہلے باب میں پرانی دہلی گھریلو مسائل کو بے باکی سے بیان کیا ہے جس میں کمشنر اور ان کی بیگم کے حالات اور دونوں بیٹوں کا احوال بیان کیا ہے جیسا کہ ناول کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک بیٹا تو کافی خوش ہے۔دوسرا قید و بند میں اور ان کی بیگم اور بچے مصیبت میں دن گذارتے ہیں۔پھر یہ نیک صالح عورت امراؤ بیگم خدا پر بھروسہ کرتی ہے اور اپنے خاوند کو یاد کر کے خدا کا شکر ادا کرتی ہے جس کی تصدیق مندرجہ ذیل شعر سے ہوتی ہے۔

ہائے جس طرح گذاری ہے ہمیں جانتے ہیں
کہاں ڈھونڈوں تجھے اے ناز اٹھانے والے

بہرحال یہ شعر امراؤ بیگم کی مصیبت پر صادق آتا ہے۔البتہ اس کشمکش اور آشوب زدہ ماحول میں مظہر کا لڑکا ناصر اور خورشید کی بیٹی 'جوئی' رشتہ کے چچازاد بھائی بہن ہونے کی حیثیت سے بہت میل جول کے ساتھ کھیلتے ہیں دوسرے باب میں صبح کی منظر کشی کی گئی ہے۔کوئل کوکتی ہے بادصبا جھوم جھوم کر چلتی ہے دل و دماغ کو فرحت بخشتی ہے۔پھولوں کے مسکان اور کلیوں کے چٹخنے کی آوازیں آرہی ہیں۔نمازی صبح کے فرائض سے فارغ ہو کر چہل قدمی کر رہے ہیں۔سبھی کی زبان

خدا کے ورد میں رطب اللسان ہے اور ایک گلشن ہے جو سرسبز اور شاداب ہے اس کے درمیان لوگوں کو سکون حاصل کرنے کے لیے چوکی دراز ہے اس موسم میں ناصر اور جوئی بھی ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے ہیں۔ جوئی کی عمر گیارہ اور ناصر کی تیرہ سال ہے اس دل گدگدانے والے موسم میں دونوں کے محبت کی ابتدا ہوتی ہے سبھی باتوں باتوں میں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتے ہیں، پھر گھومنے لگتے ہیں تو کبھی تخت پر جا کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جیسا کہ آغا شاعر نے دونوں کی محبت کے بارے میں مندرجہ ذیل شعر کہا ہے۔

وہ تاڑ گئے اب تو خبر چھپ نہیں سکتی
کمبخت محبت کی نظر چھپ نہیں سکتی

غرض یہ کہ دونوں باغ میں ٹہلتے اور پھول توڑتے ہیں اور پھر جوئی ناصر سے واپس کے لیے اجازت چاہتی ہے اور کہتی ہے 'میں گھر جا رہی ہوں ورنہ پریشانی ہوگی' ناصر روکتا ہے اور کہتا ہے 'کیا بے رخی ہے تم جا رہی ہوں' جوئی جواب دیتی ہے۔

مجھے اب گھر جانے دو دیر ہو جاتی ہے تو ماں مارتی ہے اور وہ رونے لگتی ہے ناصر اس کی کلائی پکڑ کر کپڑا اٹھا کر مار کا نشان دیکھتا ہے اور نشان کو اپنے ہونٹوں سے چومتا ہے اس موقع پر آغا شاعر کا مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ کریں۔

آستین ہٹ کے برق چمکی ہے
کیا کلائی ہے کیا کلائی ہے

ان نشانوں کو دیکھ کر ناصر آہ وزاری کرنے لگتا ہے اور کہتا ہے تمہاری ماں تم پر ظلم وستم کر رہی ہے آخر کیوں۔ میرے بھی تو ماں باپ ہیں۔ جوئی کہتی ہے تم امیر ہو میں غریب ہوں تم پر سب کا سایہ ہے اور میں لاوارث ہوں۔ یہ سن کر ناصر کانپ جاتا ہے اور جوئی کے لیے اس کے دل میں محبت کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ جوئی اس طرح دل دکھانے والی بات نہ کرو۔ تمہاری بات سن کو میں کانپ سا جاتا ہوں اور جوئی وہی پرانی بات دہراتی ہے۔ تم میرے ساتھ کیوں کھیلتے ہو میں تو

ایک لاوارث لڑکی ہوں تم امیر باپ کے بیٹے ہو تمہارا ہمارا کیا ساتھ اور جوئی رونے لگتی ہے اور گھر کی طرف چل دیتی ہے۔ ناصر اس کا پیچھا کرتا ہے اور خوش آمدانہ لہجہ میں کہتا ہے کہ جوئی تم ناراض مت ہو چچا کوئی چھ ماہ میں آنے والے ہیں تمہارے لیے اچھے کپڑے اور سامان لائیں گے۔ اس جگہ آغا شاعر نے دونوں کی طفلانہ محبت کو بڑی چابک دستی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جب جوئی ناصر سے خوب متاثر ہوتی ہے تو وہ خوش ہو کر ناصر سے لپٹ جاتی ہے اور پھر دونوں پھول تورنے میں محو ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں ایک بھونرا جوئی کو ستانے لگتا ہے اور ناصر کہیں چھپ کر سب کچھ دیکھتا رہتا ہے جب جوئی پریشان ہو جاتی ہے تو ناصر کو آواز دیتی ہے۔ ناصر جوئی کو اپنے بازو میں بھر لیتا ہے اور بھونرے سے کہتا ہے 'مان جا بھونرے مان جا'۔ جوئی پھولوں کی مالا بنا کر ناصر کے گلے میں ڈال دیتی ہے اور دونوں اپنے گھر کی طرف چلے جاتے ہیں۔ پھر تیسرے باب میں آغا شاعر نے کمشنر کی پر مسرت زندگی کو پیش کیا ہے۔ برسات کا موسم ہے عالی شان محل رؤسا لوگ ہیں۔ ساون کا مہینہ ہے لوگ رنگ رلیاں منا رہے ہیں عیش و مستی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ یہاں ناول نگار نے گلی قاسم جان کی رنگا رنگی کو دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ بوڑھے جوان، عورت مرد سب مستیاں لے رہے ہیں وہیں ناصر اور جوئی اور ان کے والدین اپنے آبائی گھر میں نمایاں نظر آ رہے ہیں۔ بیگم کمشنر گاؤ تکیہ لگائے پلنگ پر دراز ہیں چند بیبیاں ۔۔۔ ان کی خدمت میں یک ساعت غفلت نہیں برتتی اور چند قصہ کہانیاں کہتی ہیں۔ موسمی ہوائیں چل رہی ہیں غضب کی چہل پہل ہے۔ یہاں ہر طرح کی بیبیاں گورنمکین جوان لڑکی دوشیزہ، لال گلابی، سرمئی کلک ریزی رنگ برنگ کے دوپٹے اوڑھے ہوئے ملبوس گل اندام نمایاں نظر آ رہی ہیں۔ کچھ ضعیفہ عورتیں سفید پوش مختلف قسم کی ترکاریاں چھیل رہی ہیں۔ دوسری طرف میٹھی ٹکیاں سموسے گلگلے تلے جا رہے ہیں۔ دسترخوان میں لوازمات قرینے سے سجے ہوئے ہیں۔ مہمانوں کو رسوم کے مطابق ہاتھ دھلائے جا رہے ہیں لوگ کھانا تناول فرما کر کمشنر کے ممنون ہو رہے ہیں۔ کمشنر کا گھر ہر دن عید اور رات شب برات ہے۔ اس جگہ ہی ناصر اور جوئی اپنے والدین ساتھ نمایاں نظر آتے ہیں جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا

ہے۔اس ہما ہمی میں ناصر جلوہ افروز ہوتا ہے اور اپنی ماں کو آڑو پیش کرتا ہے ماں ناصر کو کوستی ہے کہ تم نے اپنے کپڑے گندے کر لیے۔ناصر کی بہن ذکیہ بھی کوستی ہے اور کپڑے دھونے کی تلقین کرتی ہے۔ناصر اپنے کپڑے دھولیتا ہے اور آڑو تقسیم ہونے لگتے ہیں۔حیدری خانم اپنے حصہ کے آڑو جوئی کو دے دیتی ہے اس پر ذکیہ الجھ جاتی ہے اور کہتی ہے کہ جوئی کو ایک زیادہ ملا ہے۔ناصر جوئی کی حمایت کرتے ہیں۔جوئی ایک آڑو ذکیہ کو دیتی ہے اس پر ذکیہ جھلاتی ہے اور امراو بیگم جوئی کو ڈانٹتی ہے۔جوئی شرمندہ ہوتی ہے ناصر جوئی کی حمایت کرتا ہے تو امراو بیگم ناصر کو ڈاٹتی ہے اور کہتی ہے کہ تم کون ہوتے ہو جوئی کی حمایت کرنے والے ادھر حیدری خانم ناصر کو ڈاٹتی ہے اور ناصر ماں کے ڈر سے باہر چلا جاتا ہے اور جوئی بے زبان گھٹ گھٹ کر خون کے آنسو پیتی ہے۔ذکیہ منرے سے آڑو چھیل کر کھاتی ہے۔جوئی اور ناصر ایک دوسرے کے درد میں غرق ہیں اس موقع پر آغا شاعر نے ایک شعر میں دونوں کی ہمدردی ظاہر کی ہے ۔

درد مندوں کو فقط اشارہ ہی کافی ہے
آہ کی ٹھیس لگی آبلہ دل ٹوٹا

جوئی ماں کے ڈر سے دور سے جنگل میں گھومتی ہے جہاں ناصر سے ملاقات ہوتی ہے دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر محبت کا دم بھرتے ہیں ناصر کہتا ہے کہ تم یہاں گھوم رہی ہو میں تیری فرقت میں گھٹا جا رہا ہوں۔دونوں کوئل کی میٹھی آواز کو یکسوئی سے سنتے ہیں اور اس میں محو ہو جاتے ہیں چوتھے باب میں خورشید قید سے رہا ہو کر پرائیوٹ نوکری کرتا ہے اور خوشیوں اور شادمانیوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے اس کی عکاسی مندرجہ ذیل شعر سے ہوتی ہے ۔

دنبالہ ان کی تند نگاہی میں آگیا
کھنچ کر کماں سے تیر گواہی میں آگیا

دیکھتے ہی دیکھتے بیگم کمشنر کا انتقال ہو جاتا ہے۔اس کے اقرباء ماتم کرتے ہیں۔حیدری بیگم اور مظہر دکھاوے کا واویلا مچاتے ہیں بہ نسبت خورشید اور امراوء بیگم کے۔دونوں فریق میں نفرت کا

جذبہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ پانچویں باب میں ناصر اور جوئی کی محبت بام عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے بیقرار اور بیتاب رہتے ہیں۔ دونوں کی بیبا کی دیکھ کر دونوں پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے اور دونوں چہار دیواری کے اندر ایک دوسرے سے الگ قید و بند کی زندگی گزارتے ہیں۔ ایک دن جوئی سیر کو جاتی ہے وہاں ناصر بھی آجاتا ہے۔ دونوں کی ملاقات تنہائی میں ہوتی ہے دونوں آپس میں خوب باتیں کرتے ہیں۔ جوئی بھائی کے خوف سے درخت کی اوٹ میں چھپ جاتی ہے۔ ناصر اس کا آنچل پکڑ کر کھینچتا ہے کہ اس وقت احمد اور مقبول آجاتے ہیں اور ناصر واپس بھاگ جاتا ہے۔ چھٹے باب میں احمد ناصر اور جوئی کے متعلق سب کچھ ماں سے بتلا دیتا ہے۔ امراو بیگم اسے کوستی ہے اور سخت پابندی لگا دیتی ہے۔

دونوں ایک دوسرے کے لیے پریشان ہوتے ہیں اس طرح ان کے عشق کا پردہ فاش ہو جاتا ہے اور ساتواں باب شروع ہو جاتا ہے !

کیا تصور ہے واہ رے تصویر
اتر آئی ہیں دل میں یار کی آنکھیں
یاں پہ لب لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خاموشی تیری سب کے جواب میں

آٹھویں باب کی شروعات کچھ اس طرح کی ہے۔ دونوں قید و بند میں پریشان ہیں اس کی نشاندہی جوئی کی اس گنگناہٹ سے ہوتی ہے۔

'چپ رہ دل ناصر ناصرنہ کیا کر'

نویں باب میں کشمیری دروازہ کا منظر ہے ناصر کالج میں پڑھتا ہے جہاں اس کے جگری دوست محسن سے ملاقات ہوتی ہے اور محسن ناصر سے ہم کلام ہوتے ہوئے یہ شعر پڑھتا ہے۔

شباب آنے نہ پایا کہ عشق نے مارا
ہمیں بہار کے لالے پڑے خزاں کیسی

دسویں باب میں مظہر اور حیدری بیگم اپنے فرزند ارجمند کے بارے میں سوچتے ہیں کہ کس طرح اس کو اس راہ سے ہٹایا جائے تا کہ انٹرنس پاس کر لے آخر یہ بات طے پاتی ہے کہ والدین نے مکان میرے نام کر دیا ہے اس میں خورشید کا کوئی حق نہیں اس طرح خورشید کو اس مکان سے بے دخل کر دیتا ہے۔ گیارہویں باب میں مظہر اپنے بیٹے کو جادو ٹونے سے بچانے کے لیے ایک پیر صاحب کے پاس لے جاتا ہے اس کے ساتھ اس کی اہلیہ بھی ہوتی ہے وہاں پیر صاحب ان کے ملازم اور دیگر مدعا خواں سے بات ہوتی ہے اور حیدری خانم تعویز لے کر لوٹتی ہے۔ بارہویں باب میں مظہر کسی عشق کا ذکر ہے اور پھر ناصر جوئی کو خط لکھتا ہے اور جوئی رو رو کر آخری سلام کے ساتھ معزرت خواہ ہوتی ہے۔ تیرہویں باب میں ناصر اور جوئی کی شادی کی بات ہوتی ہے مگر ناصر اس شادی سے انکار کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ جب میں خود کفیل ہو جاؤں گا پھر شادی کروں گا۔

یہاں آغا شاعر سے بھول ہوگئی ہے کہ جولڑکا اپنی معشوق کی جدائی میں اپنی جان دے دیتا ہے اس کو قبل اس کے شادی سے انکار کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ اس سے ناصر کے کردار میں فتور پیدا ہو گیا ہے۔ جو عاشق اپنی معشوق کے بچھڑ جانے سے خودکشی کر سکتا ہے وہ اپنی معشوق سے شادی سے کیسے انکار کر سکتا ہے۔ صرف اس بنیاد پر کہ خود کفیل بن جاؤں جبکہ لڑکی کے کردار کو آغا شاعر نے بڑی دلکشی سے پیش کیا ہے جب ناصر خودکشی کر لیتا ہے تو جوئی اپنا گلا کاٹ کر اس سے ہم آغوش ہو جاتی ہے جس پر تھوڑی دیر کے لیے یقین کرنا ممکن نہیں مگر یہاں معاشقہ کا بیان ہے جوئی کے دل میں سچی محبت رہی ہو ممکن ہے والدین کی وجہ سے چھپا رکھی ہو مگر جس سے تجاوز کرنے پر وہ بیبا کی کے ساتھ اس محبت کا اعلان کرتی ہے اور نتیجتاً خودکشی کر لیتی ہے۔

اس طرح جوئی بے وفائی کے باوجود باوفا ثابت ہوتی ہے مگر ناصر پیہم وفا کے راستے پر گامزن رہ کر بھی شادی سے انکار کرنے پر بے وفا ثابت ہوتا ہے۔ یہاں آغا شاعر نے فن اور تکنیک کو بالائے طاق رکھ کر جذبات سے کام لیا ہے۔

بہر کیف ناصر شادی سے انکار کرتا ہے۔ امراؤ بیگم اور حیدری خانم میں جھڑپ ہوتی ہے اور

اختلاف زور پکڑتا جاتا ہے چودھویں باب میں خورشید مقدمہ ہار کر اپنے اہل وعیال کے ساتھ دوسری جگہ منتقل ہو جاتا ہے۔ ناصر کی عمر اٹھارہ اور جوئی کی سولہ ہے اس بات میں آغا شاعر نے پرانی دلی کے پرفضا ماحول رنگینی کے ساتھ پیش کیا ہے جس میں رسم ورواج کے طور طریقہ غرض یہ کہ زندگی کے تمام شعبہ کی عکاسی کی ہے۔ مظہر اور حیدری خانم نے اطمینان کا سانس لیا مگر کہاں بلا تو اب آرہی ہے۔ ناصر عاشق نامراد جو جوئی سے ملنے کی تاک میں تھا۔ ناصر اپنے دوست محسن کے گھر جاتا ہے حولالہ پیارے لال کا کرایہ دار تھا اس کے گھر کی چھت کے ذریعہ جوئی تک پہنچتا ہے جوئی اپنے بام پر انگڑائیاں لے رہی تھی۔ دونوں کی ملاقات ہوتی ہے۔ پندرہویں باب میں مظہر ناصر کو اعلی تعلیم کی ترغیب دیتا ہے۔ سولہویں باب میں ناصر کے اوپر ظلم وتشدد کا ذکر ہے اس کی ذہنی کیفیت کی عکاسی آغا شاعر کے اس شعر سے ہوتی ہے ۔

گرے پڑتے ہیں پہلے سایہ سے
کچھ عجب اپنا حال ہے اب تو

ناصر کے والدین تین دن کے سفر سے واپس آتے ہیں اور بیٹے کے احوال سن کر ماں باپ کی محبت عود کر آتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے پھر سبھی لوگ ناصر سے لپٹ جاتے ہیں۔ ادھر خورشید اور جوئی کی منگنی بلی ماران کے ڈاکٹر اولاد علی کے صاحب زادے محمود علی سے ہو جاتی ہے۔ یہاں آغا شاعر نے فتح پوری، بلی ماران، چاندنی چوک ساتھ ہی دریبہ کلاں، کوچہ بلاقی بیگم کا بہت دل کش منظر کھینچتا ہے اس طرح اس باب میں شادی کی بات پکی ہو جاتی ہے۔ مگر جوئی بہت پژمردہ ہے اس کے بر عکس ناصر اٹھارہویں باب میں اپنے والدین سے نالاں ہے۔ وہ جوئی سے شادی کے لیے باپ کو خط لکھ کر ماں کے ذریعہ بھجواتا ہے۔ مظہر کالج سے واپس آتے ہیں تو سارا ماجرا حیدری خانم سناتی ہے۔ مظہر صاحب کہتے ہیں جوئی کی شادی طے پا گئی ہے جو کم ذات ہے گھر میں ڈومنیاں اور ہجڑے ناچتے ہیں۔ اچھا ہوا میرا لڑکا بچ گیا۔ ناصر کا خط پڑھ کر بہت آبدیدہ ہوتا ہے۔ اپنی اہلیہ سے منشی گل بازگی بیٹی کے متعلق بات کرنا ہے حیدری خانم کہتی ہے کہ لڑکا کسی حال میں تیار نہیں ہے۔ ناصر صرف

جوئی سے شادی کرے گا۔ ورنہ اس نے اپنی رائے لکھ دی ہے۔ مظہر چار و نا چار اپنے بھائی خورشید کو منسوب کے بارے میں خط لکھتا ہے۔ انیسویں باب میں خورشید اس رشتہ کو منظور کر لیتا ہے اور ایک مقرر تاریخ کے بارے میں کہہ دیتا ہے کہ اس تاریخ تک میں انتظار کروں گا۔ اتنے میں خورشید کو تار ملتا ہے کہ مہاراجہ بیکانیر نے یاد کیا ہے وہ وہاں کے لیے روانہ ہوتا ہے۔ بیسویں باب میں جوئی کی حرما نصیبی مجبوری، اضطرابی بے چینی کو بڑے درد بھرے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ صرف ناصر کی یاد میں بے ہوش پڑی رہتی ہے۔ اکیسویں باب میں مظہر کو خورشید کا خط ملتا ہے کہ تو اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ دیکھو اچھا ہوا اب لڑکے پر پابندی لگا دو کہ کہیں جانے نہ پائے۔ جوئی کی شادی فلاں تاریخ کو ہو جائے گی پھر سب کچھ بھول جائیگا۔ ناصر پر پابندی لگ جاتی ہے مقررہ تاریخ ٹل جانے سے جوئی کی شادی محمود علی مڈل فیل سے ہوگئی۔ اس بات ناصر کو صدمہ پہنچتا ہے اور وہ اپنے والدین سے شکایت کرتا ہے کہ آپ وعدہ کر رکھا تھا کہ تیری شادی صرف جوئی سے ہوگی مگر ناصر کے والد کی مکاری دیکھئے کہ اس نے اس سے لاعلمی ظاہر کی۔ آخر کچھ دن تو ناصر نے خوب رو رو کر جی ہلکان کیا اور گھر کے سارے افراد کو خوب بہ دعائیں دیں کہ تم لوگوں نے میرے ساتھ دھوکہ کیا پھر ایک دن وہ عاشق انتقال کر گیا۔ جب ناصر کے انتقال پر ملال کی خبر جوئی کو ملی تو جوئی نے بیبا کی کے ساتھ سسرال اور دنیا والوں کو ٹھکرا کر اپنی سچی محبت کی گواہی دینے ناصر کی میت تک پہنچتی ہے اور خنجر سے اپنے حلقوم کاٹ کر ناصر سے ہمیشہ کے لیے مل جاتی ہے۔

اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ ناصر اور جوئی کی محبت سچی تھی اگر اس دنیا میں نہیں تو عالم برزخ میں دونوں ایک دوسرے کے ہو گئے۔ آغا شاعر کے اس ناول کے انجام سے ذہن شوق لکھنوی کی مثنوی زہر عشق اور میر کی مثنوی شعلہ عشق کی طرف جاتا ہے کہ دونوں مثنویوں کا انجام بھی اس طرح کا ہے۔

ناصر جوئی، امراؤ بیگم، حیدری خانم، مظہر ناول 'ارمان' کے مرکزی کردار ہیں جن کے گرد ساری کہانی گھومتی ہے۔ اس کے علاوہ خورشید احمد، محسن منیر ذکیہ وغیرہ معاون کردار ہیں جو وقتاً فوقتاً بہ قدر

ضرورت نمودار ہوتے ہیں۔اس ناول میں ایک پورے خاندان کو جگہ دی گئی ہے۔ جتنا اثر ناصر اور جوئی کے کردار پڑتا ہے اتنا کسی پر نہیں اس صورت میں ہم ناصر کو ہیرو اور جوئی کو ہیروئین کہہ سکتے ہیں۔ جوئی اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی ہے۔جیسا کہ ناصر نے بغاوت کر کے انانیت کی دیوار توڑ دی۔ جوئی سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنے والدین اور رسم ورواج کی پابندی فرض سمجھ کر کرتی ہے۔ایک طرف جوئی کا کردار اہم ثابت ہوتا ہے کہ جہاں وہ اپنے والدین کی عزت رکھ لیتی ہے تو دوسری طرف محبت کی خاطر بغاوت نہ کر کے اپنے کردار کو کمزور بناتی ہے۔ جوئی کے لیے یہ ممکن نہ تھا اس لیے کہ وہ مجبور تھی وہ جوئی کہ کردار سے آغا شاعر نے بیسویں صدی کے مسلمانوں کی مشرقی روایت کو زندہ رکھا ہے کہ لڑکا اپنے رومانس کی خاطر بغاوت کر سکتا ہے مگر ایک مشرقی خاتون ایسا نہیں کر سکتی۔

دوسرا کردار مظہر کا ہے جو اپنے عہد کا نمائندہ ہے وہ ہر وقت اپنی بلندی پر رہنے والا انسان ہے اس کا ذہن نیچے آنے کو تیار نہیں ہے۔اپنے متکبرانہ مزاج کی وجہ سے خون کو خون نہیں سمجھتا اپنی انا کی خاص بھائی کو تباہی کے راستے پر چلاتا ہے اور بیٹے کے جذبات کو ٹھیس لگا کر لقمہ اجل کا مزہ چکھا دیتا ہے۔اس کے کردار میں مکاری عیاری، دغابازی بھری پڑی ہے۔مظہر کا کردار ناول کو جلا تو بخشا ہے مگر تنقیدی نقط نگاہ سے ذلیل اور بدمزہ کردار ہے۔

ناصر کا کردار جوئی کے کردار کے برعکس بے حد اہم اور نمایاں ہے جو ناول کے اوراق میں درخشندہ ستارے کی مانند چمک رہا ہے۔مگر ناصر کا کردار بھی ایک جگہ کمزور پر تا دکھائی دیتا ہے کہ اس نے شادی سے صرف اس لیے نکار کیا کہ وہ خود کفیل نہیں تھا۔ یہ غدر سچے عاشق کے لیے جائز نہیں۔ ناصر کا باپ اس کے حال سے متاثر ہو گیا تھا اگر ناصر شادی کر لیتا تو مظہر ہو حال میں اس کی کفالت برداشت کر سکتا تھا۔ چند دن دقت ہوتی مگر اس کے بعد حالات سازگار ہوتے چونکہ ناصر کی ماں اس شادی کے لیے من وعن تیار تھی۔ یہ سچ ہے کہ عورت کے سامنے مرد کو جھکنا ہی پرتا ہے۔ناصر کی ماں اس کی حمایت کرتیں۔ حالات سازگار ہوتے اور ناصر بھی تو روزی کمانے کے لیے کچھ کر سکتا تھا۔ تنقیدی نقطۂ نگاہ سے ناصر کا کردار بھی کچھ ڈھیلا ڈھالا ہے مگر جہاں وہ زہر کھالیتا ہے تو دنیا میں اپنا

مقام بناتا ہے۔اس کے برعکس حیدری خانم کا کردار شروع سے آخر تک صاف ہے۔جیسا کہ ناول کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ حیدری خانم امراؤ بیگم کے تعلقات ہمیشہ سازگار رہے ہیں۔مگر ایک جگہ جہاں ناصر آڑو لے کر نمودار ہوتا ہے۔اس جگہ ناصر کی اپنی بہن سے جھڑپ ہو جاتی ہے مگر جوئی کے ساتھ اس کا رویہ مناسب ہے اور اپنا آڑو جوئی کو دے دیتی ہے دوسری جگہ امراؤ بیگم اور حیدری خانم کے درمیان شادی کی بات ہوتی ہے تو حیدری اپنے بیٹے کی نالائقی پر امراؤ بیگم سے الجھ جاتی ہے اور ناصر کا تعلق جوئی سے ختم کرنے کے لیے تعویز لیتی ہے۔اس طرح خانم کا کردار بھی نقص سے پاک نہیں ہے لیکن موہم سا نقص ہے جو کوئی معنی نہیں رکھتا۔اس طرح خانم کا کردار بھی نمایاں ہے امراؤ بیگم کا کردار بھی شروع سے معصوم اور سادہ نظر آتا ہے۔مجموعی طور پر جب ہم تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں تو دونوں کا کردار اس میں جہاں باہمی رقابت ہی نہیں بلکہ مروت محبت ملتی ہے اس طرح خورشید کا کردار اہم ہے کہ مظہر نے مقدمہ کر کے زمین سے بے دخل کر دیا شادی کا پیغام دے کر بھی دغا کیا سب کچھ خورشید نے برداشت کیا صرف اتنا کہ سکا کہ بھائی ہے اس طرح اس نے انسانیت کا ثبوت دیا۔بقیہ سبھی کردار ناول کی طوالت کے لیے ضمنی طور پر دیے گئے ہیں۔

ارمان ایک نفسیاتی ناول ہے اس کا تذکرہ پہلے بھی ہو چکا ہے جو آغا شاعر کی زرف نگاہی کی پیداوار ہے۔آغا شاعر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان تحریروں میں اس سماج کی عکاسی ہے۔ انہوں نے اپنے دور پر بھی زبردست طنز کیا ہے۔آغا شاعر کا ناول 'ارمان' دلچسپی اور دلکشی بھی رکھتا ہے ان کے اس ناول میں چند چھوٹے کردار کے علاوہ سارے کردار شروع سے ناول سے ناول کے صفحات پر ہمارے سامنے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں ہم اس کی ذہنیت اور شخصیت سے بخوبی واقف ہو جاتے ہیں۔جیسے حیدری خانم ایک معاون کردار بھی حیدری کے کردار سے کچھ کم اہم نہیں ہے۔ناول 'ارمان' میں جذبات نگاری کی بہتات ہے جس کی بنیاد نفسیات انسانی پر ہے۔یہی وجہ ہے کہ آغا شاعر کی ناول نگاری کو رومانی کہا گیا ہے منظر کشی اس ناول کا زیور ہے جو واقعات و کردار سے قریب تر معلوم ہوتی ہے جس میں حسن و عشق کا دریا تلاطم خیز ہے۔

جس طرح شرر ناول کے در یعہ تاریخ کے حوالے سے اسلام کی عظمت کو بروئے کار لائے ہیں اور راشد الخیری نے مشرقی روایات کو قائم رکھنے کی جستجو کی ہے اسی طرح آغا شاعر نے اپنے ناولوں کے ذریعہ اس عہد کے مسلمانوں کی رومانی معاشرتی اور نفسیاتی زندگی پر تبصرہ کرنے کی کوشش کی ہے دراصل موصوف کا یہ رجحان مغربی تہذیب وتمدن کی یلغار سے محافظت کے حوالے سے وجود میں آیا تھا۔انہوں نے ناول 'ارمان' کے دزیعہ وہی کام انجام دیا جس کی تلقین اکبرالہ آبادی کی شاعری میں ملتی ہے اس ناول سے آغا شاعر نے مشرقی تہذیب کی مستحکم حمایت کی ہے۔انسانی شعور کی رو کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ یہ ناول فن اور تکنیک کے اعتبار سے مکمل اور مستحکم ہے۔'ارمان' کے مطالعہ سے فلسفہ حیات کا پتہ چلتا ہے کہ۔وہ تعلیم یافتہ سماج کی بنیاد ڈالا چاہتے ہیں۔اس کے لیے وہ تعلیم نسواں کو ضروری قرار دیتے ہیں۔اس لیے کہ ماں کا گود ہی بچوں کا اولین مدرسہ ہوتا ہے۔اس کے متعلق وا لگ اور وارن نے کہا ہے 'خاندان ہی انسان کی زندگی کے بارے میں سارے تصورات کی تشکیل کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آغا شاعر نے ایک خاندان کے نزاع کو روحانی پیار میں پیش کیا ہے جس میں آغا شاعر نے دکھایا ہے کہ والدین کی بے توجہی اور نفرت کے سبب کئی معصوم جانیں ضائع ہوسکتی ہیں۔

اس ناول میں مظہر کے کردار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تعلیم یافتہ مسلم ضرور ہے مگر اس کے خیالات مغربی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ ناصر کی شادی جوئی سے نہیں ہونے دیتا۔اس مغربی رنگ کی بنا پر بھائی سے نفرت کرتا ہے۔اس طرح مظہر کا کردار آغاز سے اختتام تک مغرب پرستی کا نمائندہ بن گیا ہے۔کبھی سفر میں ہے تو کبھی کالج یونی ورسٹی میں کبھی شرفا کی مجلس میں نظر آتے ہیں اس طرح آغا شاعر کا ناول 'ارمان' مشرقی پائیداری اور قدامت پسندی کی حمایت اور مغرب پرستی سے انحراف کا آئینہ دار ہے اس کے علاوہ جتنے بھی کردار ہیں سبھی کردار مشرقی پائداری کی اچھی مثال ہیں اس طرح آغا شاعر کے ناول اپنی طرز میں کامیاب کہے جاسکتے ہیں۔یہ ناول ان کو خوب شہرت بخشتی ہے۔

آغا شاعر جس کی اہتمام اور شدومد سے ارمان اور نفسیات کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ ناول 'ارمان' میں پوری طرح رواں دواں ہے۔ اپنی انا کی خاصر جو لوگ معصوموں کی قربانی دیتے ہیں اس کے خطرناک انجام کو آغا شاعر نے ناول 'ارمان' میں خوبصورت پیرائے میں پیش کر دیا ہے۔ انا کے ہجاری والدین کے درمیان کشمکش کی چکی میں دو معصوم پھول کس طرح پستے ہیں مگر انہیں اس کا احساس تب ہوتا ہے جب وہ پھول ٹہنی سے بچھڑ کر خاک کے دامن میں سما جاتا ہے۔ انہیں باتوں پر ناول کا پورا پلاٹ گردش کر رہا ہے۔

ناول 'ارمان' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آغا شاعر مشرق کے دلدادہ تھے ہی مگر ساتھ ہی وہ مغربی تہذیب کی رنگا رنگی سے اپنی ضرورت کی چیز حاصل کرنے میں گریز نہیں کرتے تھے ان کا ناول 'ارمان' مشرقیت پر مبنی ہے مگر مغربیت کا رنگ بھی دیکھنے کو ملتا ہے جیسے مظہر کا کردار جو پوری طرح مغرب پرست ہے اور پھر اپنے اندر آغا شاعر نے مشرق اور مغرب کی خصوصیات کو پرو دیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آغا شاعر رومانی تحریک سے وابستہ رہے ہیں۔ مگر اس کے اثرات کو قبول نہیں کیا۔

آغا شاعر نے 1903ء میں 'ارمان' کے علاوہ ہیرے کی کنی اور دیگر ناول لکھے۔ ان کے ناول اردو ناول کی ترقی میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ارمان میں خاندانی نزع اور افراد کی کشمکش کو بڑی چالاکی سے قلمبند کیا گیا ہے۔ فرد اور سماج میں جو آویزش ہوتی ہے اس ناول میں پیش کیا گیا ہے۔ دونوں کی کشمکش سے اس تہذیبی امتزاج کا نقشہ سامنے آتا ہے جو بیسویں صدی کے پہلے سے ہی ہندوستان میں زور پکڑ رہا تھا۔ جس طرح ناصر کا کردار بدلتے ہوئے معاشرہ کا شکار ہے جیسا کہ مشہور ہے بیسویں صدی میں جسم و روح مادیت اور روحانیت کی کشمکش میں عام انسان کا اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے۔ اس طرح اس عہد میں معاشرے کی تبدیلی سے فرد کی نفسیات پر جو اثرات پڑے اس کو ارمان میں بڑی فنکارانہ خوبیوں سے پیش کیا گیا۔ مقصد کے بارے میں کانٹ نے بھی ضروری اور اہم بتایا ہے یہ اور بات ہے کہ فن مقصدیت کا شکار ہو جاتا ہے مگر ناول میں مقصد کا ہونا

فن کا نقصان نہیں کسی مقصد یا نظریہ کے بغیر کسی فن پارہ کی تخلیق نہیں ہوسکتی۔اس بارے میں ارتھر کو سلو کا یوں کہنا ہے۔ہم کو فن کی مقصدیت کے متعلق کوئی اقتباس نہیں رکھنا چاہیئے کیوں کہ فن کے پیچھے کوئی نہ کوئی نظریہ ضرور ہوتا ہے۔7

ارمان مقصدی ناول ہے یہ اور بات ہے کہ ناول نگاروں کی نظر سے دور طاق نسیاں کی زینت بنا رہا ہے اس کا کردار اور پلاٹ اس نوعیت کا ہے کہ خود قاری اس سے نتیجہ اخذ کر لیتا ہے کہ اس رول کی اہم ترین خصوصیت کرداروں کی نفسیاتی پیشکش ہے۔فوسٹر نے کہا ہے کہ 'پوشیدہ جذبات کو پیش کرنا ناول نویس کا عظیم کام ہے8

ڈیوڈ سیل نے کہا ہے 'انسانی فطرت سے مکمل آگہی ظاہر کرنا ناول نویس کا کام ہے۔9انسانی فطرت اور نفسیات سے آگہی آغا شاعر کے یہاں بھی ملتی ہے جیسا کہ اس عہد کے دوسرے ناول نویسوں کے یہاں بھی۔ایسا اس لیے ہوا ہے کہ آغا شاعر نے انسانی نفسیات کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔اس لیے کہ وہ انگریزی منطق، ادب فلسفہ تاریخ غرض ہر شعبہ میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ ارمان میں کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ شروع سے آخر تک موجود ہے۔فرائڈ نے کہا ہے کہ 'فنکار تصور کی دنیا میں اس لیے محو ہو جاتا ہے کہ وہ حقیقی دنیا میں اپنی خواہشات کی تسکین نہیں کر سکتا۔10 اور یہی چیز ارمان میں پیش کی گئی ہے اس طرح ناولوں میں کرداروں کی خواہشوں کی تکمیل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

مگر ناول ارمان کا ہیرو منزل مقصود تک نہیں پہنچ پاتا ہے وہ جذبات وخواہشات دبا لیتا ہے۔جو فرائیڈ کے متعلق صرف الم سے بچنے کے لیے دب جاتی ہے۔11اس لیے کہ اس کو برقرار رکھنے سے سماجی قوت اسے تکلیف پہنچا سکتی ہے۔اس لیے ایسی خواہش رد کر دی جاتی ہے۔12 مگر یہ لاشعور میں باقی رہتی ہے اس ناول میں جوئی ناصر کی فطرت کو اپنی مرضی کے مطابق موڑ دیتی ہے جبکہ ناصر کے لاشعور میں فطری خواہش پنہاں ہے اس کے برخلاف جوئی ناصر کی موت کی خبر سنتی ہے تو غیر شعوری طور پر اپنی محبت کا انکشاف کر دیتی ہے اس طرح آغا شاعر نے بالکلیہ نفسیاتی

اسباب ظاہر کیے ہیں دونوں ہی خوش گوار زندگی گذارتے تھے مگر دونوں ذہنی مریض تھے کہ دونوں ایک دوسرے میں ضم ہو جانا چاہتے تھے جس کا پودہ بچپن میں ہی لگ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یونگ نے کہا ہے کہ 'ہر مرد ایک عورت کی تمنا رکھتا ہے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ لاشعور میں چھپی اس عورت کو تخیلی طور پر کسی وقت بھی جسمانی صورت دی جا سکتی ہے۔12 اس طرح ناصر نے بھی جوئی کو اپنے تصور میں بسا لیا تھا۔ یہ تصویر جوئی کی طرح تھی تو دل دے دینا لازمی امر تھا جیسا کہ دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے پر جان چھڑک رہے تھے اس لیے جب ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو جذباتی ہو کر ملتے ہیں۔ یونگ کا قول ہے کہ والدین اپنی اولاد کو ایسی زندگی گزارنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ جس کو وہ خود حاصل کرنا چاہتے تھے مگر نہ کر پائے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت زیادہ اخلاق پر زور دینے والے ماں باپ کے بچے غیر اخلاقی حرکتوں میں منہمک ہو جاتے ہیں یا پھر اس کے برعکس ہوتا ہے۔13 مظہر کی سخت گیری نے ناصر کے کردار میں یہی بات پیدا کر دی ہے کہ جس کی وجہ سے وہ ساری بندشوں اور قیود کو توڑ کر آزاد ہو جانا چاہتا ہے اور اپنی نفسیاتی حالات کے ساتھ جوئی کی یاد میں محو رہتا ہے ساتھ ہی یہاں ایک اور اہم واقعہ پیش آتا ہے کہ جوئی کی ماں ناصر کو یہ کہہ کر کوستی ہے کہ جوئی کون ہے تمہاری جو اس کی حمایت کرتے ہو۔ جو ناصر کو گراں گزرتا ہے۔ اس طرح آغا شاعر نے مخلوط خاندان کے ایک اہم نفسیاتی پہلو کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ آغا شاعر نے اس ناول میں جگہ جگہ نفسیاتی بصیرت کا ثبوت فراہم کیا ہے اور زندگی کی حقائق کی عکاسی کی ہے جیسا کہ سہیل بخاری نے ناول ارمان کے متعلق لکھا ہے۔

> ارمان بھی ایک رومانی ناول ہے جس میں ایک خاندان کے نزاع کے المناک نتائج دکھائے گئے ہیں۔ اس ناول میں بڑی چابک دستی سے متوسط طبقہ کی خانگی معاشرت کی نقشہ کشی کی گئی ہے۔ مصنف نے جس اہتمام کے ساتھ دو معصوم دلوں میں محبت کا بیج ہویا ہے اور جس نفسیاتی انداز

میں ان کی عمر کے ساتھ ساتھ اس ننھے سے پودے کو پروان
چھڑھایا ہے وہ تاثیر درد او کسک میں آپ اپنی مثال ہے
اول الذکر ناول کی جملہ خوبیوں کے علاوہ اس میں آغا
شاعر کی حقیقت نگاری کا بھی کمال نظر آتا ہے۔ یہ ناول
اپنی معصوم رومان کی دلکش آغاز اور فطری انجام لطیف و
بلیغ کتابوں نفسیاتی اشاروں حقیقی مرقع کشی۔ واقعیت
نگاری ڈرامائی انداز بیان اور کرداری ارتقاء اور پر تاثیر
مکالموں اعلی انشا پردازی کے باعث اردو ادب کا ایک
نادر شاہکار ہے۔13

'ہیرے کی کنی' ناول 'ہیرے کی کنی' اردو ناول نگاری میں آغا شاعر کا وہ قیمتی سرمایہ ہے جس پر انسانی فلسفہ حیات کی بنیاد ہے۔ اس ناول کا پلاٹ ایک سولہ سالہ لڑکی کی نازیبا حرکت اور جنسی خواہشات کی لذت پر مبنی ہے اور نواب جہانگیر احمد کی نازیبا حرکات پر بھی اس ناول کی نوعیت دلکش اور دلفریب ہے۔ ناول کہ مطالعہ سے قاری کا دل و دماغ خوش رنگ ہو جاتا ہے۔ اس کے متعلق آغا شاعر نے لکھا ہے کہ ہیرے کی کنی ایک ایسا ناول ہے جس میں بیسویں صدی کی حکومت ہند کے ولی عہد کی ناشائستہ حرکات اور رومانس کو دلچسپ بنا کر پیش کیا گیا ہے ناول ہیرے کی کنی انیس باب پر مبنی ہے۔ ہر باب کا ربط و تسلسل ایک دوسرے سے یکساں اور قریب ہے۔ ساتھ ہی مفصل اور متعین نصب العین بھی اس میں کثرت سے نظر آتا ہے۔ ہیرے کی کنی میں جس ماحول کی عکاسی کی گئی ہے اس کا نصب لعین ہندوستانی حکومت کے ولی عہد کی نازیبا حرکات غیر ذمہ دار اور ناعاقبت اندیشی ہے جس کی آگ میں پوری ریاست جل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغا شاعر کا ناول ہیرے کی کنی جس میں بیسویں صدی کے اوائل ہندوستانی روایت، رسم و رواج، حکومت سیاست کا رنگ سماجی، معاشی سیاسی تعلیمی، مذہبی اقتصادی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ اس میں آغا شاعر نے دلی

کے قدیم تہذیب و معاشرت کی عکاسی کی ہے۔ادنیٰ اعلی کی سوسائٹی امرا' رؤسا' کی محل سراؤں، گلی کوچوں بازاروں کی رنگ برنگی زندگی کی مرقع کشی بڑے دلکش انداز میں کی گئی ہے ۔نواب جہاں گیراور سلطانہ بیگم ناول کے مخصوص کردار ہیں جورومان کا مرکز ہے۔جو دلی کی پرانی معاشرتی اور لاابالی پن فضا کا پروردہ ہے دوسری طرف دہلی کے نوابین کی مصاحبین کا نمائندہ ہے۔دوسرے نمبر کا کردار کبریٰ کا ہے۔جس کی بنیاد بے وفائی پر ہے۔مگر نواب جہانگیر دار ہوس کا شکار ہونے کی وجہ سے کبریٰ کو دل و جان سے چاہتا ہے اور پھر آخر میں کبریٰ کے بے وفائی بے حد شرمندہ ہوتا ہے اور پریشان رہنے لگتا ہے کہ سلطانہ بیگم جو کہ بچہ ایاز بن کر نواب کی خدمت میں آتی ہے وہ نواب کو صداقت پر مبنی زندگی گذارنے کی تلقین کرتی ہے اور اسے درس دیتی ہے کہ انسان کا فلسفہ حیات کیا ہے اور اس کے پیچھے خدا کی مرضی کیا ہے اس کو سمجھئے اور اسکے مطابق زندگی گذارئے دنیا تو فرضی ہے۔ابدی زندگی تو عالم برزخ ہے اس کا سامان حیار کر واس طرح سلطانہ بیگم کو بھی اس ناول کا اہم کردار مانا جاسکتا ہے جو مختلف حرب وضرب میں ماہر ہے سچا عاشق اور باغی دوشیزہ ہے حسین صحتمند ہے۔سچائی کا ثبوت فراہم کرنا اس کا شغل ہے مجموعی طور سے ناول 'ہیرے کی کنی' فنی اعتبار سے بڑے پایہ کی چیز ہے یہ اور بات ہے کہ اس میں رومان کا پہلو زیادہ ہے۔مگر امراؤ سے لے کر غربا تک کی زندگی کا آئینہ دار ہے جو بیسویں صدی کی ٹھاٹھ باٹھ پر محیط ہے۔یہاں ہیرے کی کنی کے پلاٹ کو مختصر طور پر قلم بند کرتا ہوں اس سے ناول کی نوعیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

پہلے باب میں ناول نگار نے ایک سولہ سالہ لڑکی حمیدن کو پیش کیا ہے جو اپنی ماں کی بنائی میٹھی ٹکیا کھا رہی ہے اور اپنے عاشق کے متعلق سوچتی ہے اور والدین کو کوستی ہے کہ یہ لوگ میری شادی نہیں کراتے ۔اس جگہ حمیدن جذبات کی حد کو پار کرگئی ہے۔آغا شاعر نفسیات کہ ماہر نظر آتے ہیں اس عالم میں لڑکی کھانے پینے سے بے بہرہ ہے وہ ہمیشہ اپنے الجھن کے بارے میں سوچتی ہے کہ کہیں ہمارے پیار کو پڑوسی کی نظر نہ لگ جائے ۔اچھن ایک سپاہی ہے جو حمیدن کا عاشق ہے جو روزانہ چھپ کر اس سے ملتا ہے مگر حمیدن چوری کی ملاقات سے گریز کرتی ہے۔وہ تو شادی کرنا چاہتی ہے

شادی کی تکمیل نہ ہونے پر اپنے والدین کو کوستی ہے۔ نازیبا الفاظ استعمال کرتی ہے اور خواہ مخواہ احساس کم تری کا شکار ہو کر پڑوس سے نفرت کرتی ہے اس باب میں ناول نگار نے لڑکی کے جذبات کو وسعت نظر سے پیش کیا ہے۔ اس ناول میں فنی تکنیک کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے جس کی مثال باب اول میں ملتی ہے۔ ساتھ ہی بیسویں صدی کے معاشرت کو برقرار رکھنے کے لیے ایک سولہ سالہ لڑکی اس طرح کی بات سوچتی ہے جو اپنے جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہے۔ اس لڑکی کا باغیانہ پن ظاہر ہوتا ہے یہی آغا شاعر کی خوبی ہے کہ وہ جس عہد کی بات کرتے ہیں اس کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

اس باب میں ناول نگار نے نواب جاگیردار کے کردار کو پیش کیا ہے جو دہلی کے جلیل القدر نواب کا لڑکا ہے جس کا حسن یوسف ثانی اور عدل نوسیرواں جیسا ہے وہ شروع سے ہی کبریٰ سے عشق کرتا ہے۔ والد کی زندگی تک اظہار نہ کر سکا والد کے رخصت ہوتے ہی پہلا حکم صادر کیا وہ کبریٰ سے شادی کے متعلق تھا اس پروزرا میں چہ می گوئیاں ہوتی ہے اس کی ماں نے اپنے خاندان کی عزت کا حوالہ دیکر سمجھایا مگر نواب نہ سمجھ سکا۔ سبھی نے عزت خاندان ووقار کا حوالہ دیا مگر بے سود لیکن ان کا ایک ہی جواب تھا ملاحظہ ہو۔

گرجہ بد نا مبست نزد عاقلاں
مالے خواہم ننگ و نام را

چنانچہ شادی کی تجویز ہوتی ہے طے شدہ تاریخ سے قبل ایک بڑی رقم خزانہ عامرہ میں سے پر بھو مالی کو نذر کیا جاتا ہے تا کہ اپنی برادری کے لوگوں کی آو بھگت کر سکے اس طرح جہاں گیر اور کیسری کی شادی ہو جاتی ہے۔ یہاں آغا شاعر نواب اوباشی کو بیان کرتے ہیں جو اپنے والد کے انتقال کے بعد کر رہا ہے اس وجہ سے حکومت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اور مزید یہ بھی بتانا چاہا ہے کہ اگر کوئی ادنی لڑکی کو اپنانا چاہے تو اس کا کیا طریقہ تھا۔ لڑکے کی طرف سے بارات نہیں جاتی تھی بلکہ لڑکی کے والد اپنے ہاتھوں سے بیٹی کا ڈولا پہنچاتے تھے۔ ساتھ ہی انسانی جذبات کی تحلیل نفسی بھرپور انداز

سے کی ہے کہ انسان کا دل کسی پر بھی آ سکتا ہے۔ مقولہ مشہور ہے۔

دل نہ مانے اچھوت ذات
پیاس نہ مانے دھوبی گھاٹ

آغا شاعر نے بیسویں صدی کے نوابوں بادشاہوں کے کارناموں کو دکھلایا ہے جس سے ان لوگوں کی نجی زندگی سامنے آتی ہے۔ تیسرے باب میں ریاست بھوپال کا منظر ہے جس کے ولی عہد کو بھی کچھ اس طرح کا مزاج ورثہ میں ملا ہے وہاں محفل سجی سے رقص وسرود کا دور دورہ ہے یا یوں کہا جائے کہ عیاشی کا سامان موجود ہے بھوپالی رسم ورواج کے مطلق شاہجہاں پوری، عربی، فارسی ترکی لکھنوی وغیرہ اہم بڑے بڑے فلسفی تشریف رکھتے ہیں جہاں جہانگیر بھی مہمان خصوصی میں شامل ہے۔ شاہزادہ بھوپال جلوہ افروز ہوتے ہیں لوگ مودب اور خاموش ہیں ایک نوجوان موسم کو مدنظر رکھتے ہوئے گرمی کو گفتگو کا موضوع بناتا ہے جس کی بنیاد فلسفہ پر ہے۔ لفظ گرمی سے گفتگو کا موضوع نقط زبان بن جاتا ہے وہ اس طرح کے ایک لکھنوی فرماتے ہیں 'ہم سے کوئی گرم ہو کر آیا کرے گا دنیا ہمارا لوہا مانے ہوئے ہے۔

دعوی زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
اظہار بوئے مشک غزالاں کے سامنے

اس کے برعکس جو ایک دہلی والے تھے ان کو بڑا برا لگا فوراً فقرہ چست کیا۔

زبان لکھنؤ دہلی سے اچھی
ہماری بلی اور میاؤں ہمیں سے

اس طرح زبان کا مسئلہ ختم ہوتا ہے تو زر کا مسئلہ آتا ہے۔ زر کے توسط سے برے بڑے عربی فارسی داں طرح طرح کی مثال سامنے لاتے ہیں اور زر کو دنیا کی سب سے بڑی چیز ثابت کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل۔ یعنی علم وعروض علم بلاغت کا پورا پورا سہارا لیتا ہے مگر اس کا انداز تجاہل عارفانہ ایک دوسریے کے ساتھ نوک جھونک یعنی بحث سے ایک دوسرے کو

زیر کرنا ہوتا ہے انہیں باتوں پر تیسرے باب کا اختتام ہوتا ہے سب اپنے وطن کو کوچ کرتے ہیں۔

چوتھا باب جہاں گیر دار کا بھوپال سے واپسی پر لکھا گیا ہے نواب موصوف شان وشوکت سے گھوڑے کی سواری پر واپس ہو رہے ہیں۔ راستہ میں سلطانہ بیگم کا محل ہے حوا اپنے محل سے دیکھتی ہے اور سوچتی ہے کہ یہی ماہتاب ہے جس کی گود میں کیسری مالن مچلتی ہے کاش یہ مجھے نصیب ہوتا یہی لڑکی سلطانہ ناول کی کامیابی کا راز ہے اچانک گھوڑے کا رکاب ٹوٹنے سے جہاں گیر حواس باختہ ہو جاتا ہے۔ آغا شاعر نے نواب کی واپسی شام چھ بجے بتلایا ہے۔ دلی والے نواب کی شان و شوکت گھوڑے کی تعریف پر کھارت کا شباب جنگل جھاڑی چرند و پرند کی آواز سرسبز پھولوں کی وادی دونوں نواب کی دوستی جہانگیر کو مکمل گھوڑ سوار اور سلطانہ کی اضطراری کیفیت کو اتنا دلکش بنا کر پیش کیا ہے کہ منظر نگاری کا ہل باندھ دیا ہے۔ آغا شاعر کے اندر وہ صلاحیت موجود ہے کہ ایک جملہ کو کئی طرح سے کہہ سکتے ہیں۔ دلی کی ٹکسالی زبان پر مہارت ہے اردو تو گھر کی لونڈی تھی ہی۔

پانچویں باب میں احاطہ قلعہ معلّٰی میں نظام احمد خان یعنی سلطانہ بیگم کے چچا کا عالیشان مکان ہے۔ جہانگیر مدعو ہے سلطانہ جہانگیر اور کیسری کے بارے میں سوچتی ہے کہ ایک مالن نے کیا مقام پایا ہے اور نواب کی تعریف میں شعر کہتی ہے ؎

چشم یہ دور ہیں کس درجہ میں پیاری آنکھیں
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تمہاری آنکھیں

یہ دوشیزہ سلطانہ بیگم اپنے والدین کی لاڈلی اور اکلوتی دختر نیک اختر ہے باپ کا سایہ اٹھ چکا ہے اپنے چچا کے دامن عاطفت میں اپنی جائیداد کے ساتھ آزادی کی زندگی بسر کر رہی ہے وہ دنیا کے ہر ہر علم وفن کی ماہر ہے، حسن مجسم، اخلاق کا پیکر دور اندیشی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ شام ہوتے ہی تقریب ختم ہو جاتی ہے سبھی محو آرام ہیں۔ سلطانہ بیگم جو نواب پر فریفتہ ہے یہ سوچ رہی ہے کہ کس طرح میر ملاقات نواب سے ہو جائے اور نواب صاحب کی جوانی کو لوٹ لیا جائے۔ مگر وضع داری کا خیال کر کے درد قلب میں مبتلا ہو کر یہ شعر پڑھتی ہے ؎

سر میرا دیوانگی سے ہے یہاں دیوار جو
واں وہ فرق ناز محو بالش کم خواب ہے

آخر سرہانے جا کر ایک پیش بہا انگوٹھی اپنی انگلی سے اتار کر پہنا رہی تھی کہ نازک کلائی کی لوازمات سے نواب لطف اندوز ہو رہا تھا اور پھر بیدار ہو جاتا ہے۔ سلطانہ آدھی انگلی میں انگوٹھی چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے اور نواب جو کچھ دیکھا اس کا شاعر اس شعر میں ہے۔

سہ چوری بد مست آں نگارے
بد شاخ صندلیں پیچید ہمارے

چھٹے باب میں کیسری بن سنور کر اس طرح بیٹھی ہے کہ جنت کی حور دھوکہ کھا جائے اس کے حسن اور آرائش کو شعری پیکر میں یوں ڈھالا ہے۔

خدا جانے یہ آرائش کرے گی قتل کس کس کو
طلب ہوتا ہے شانہ آئینے کو یاد کرتے ہیں

جہانگیر کمرہ میں داخل ہو کر کیسری سے پیار و محبت کی بات کرتے ہیں کیسری دیہاتی زبان استعمال کرتی ہے تو نواب اصلاح زبان کی تاکید کرتے ہیں اچانک کیسری کی نگاہ انگوٹھی پر پڑتی ہے وہ فریفتہ ہو جاتی ہے تو نواب انگوٹھی کیسری کی انگلی میں ڈال دیتے ہیں اور نواب آہ بھرتے آہ ملیح ہے تو صبیح ہے۔

لگاویں کیوں نہ ایسی جنس پر ہم جان شریں کو
نمک بھاتا ہے ہم کو سانولی صورت پہ مرتے ہیں

ساتویں باب میں سلطانہ بیگم مردانہ لباس میں جہاں گیر کے دربار میں غلام محمد خان کی سفارش پر نوکری کے لیے داخل ہوتی ہے۔ نواب کو آداب بجالاتی ہے۔ اپنا نام ایاز بتاتی ہے نواب ہنس کر کہتا ہے مجھے بھی اپنا تخلص محمود رکھنا ہی پڑے گا مگر نواب یہ سمجھ گیا ہے کہ یہ بچہ وہی سلطانہ بیگم ہے۔ آخر کار نواب اپنی بات ختم کر کے شب گزاری کے لیے معذرت خواہ ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ اس

وقت میری غیر حاضری کے لیے صبح تک معاف کر دو اور ازراہ کرم اس غریب خانہ پر آرام فرمایئے۔حسرت اور کنکھیوں سے اس حور کو دیکھتے ہوئے محل کو تشریف لے گئے۔آٹھویں باب میں نواب باغ میں جلوہ افروز ہیں یہ باغ بادشاہوں کا منظور نظر شاہ جہاں آباد سے کوئی تین چار میل دور ہے۔نواب حوض کے پاس پانی سے کھیل کر لطف لے رہے ہیں۔وہاں جوگی بچہ ایاز بھی محو گفتگو ہے نواب سچائی جاننے کی کوشش کرتا ہے مگر سلطانہ ہر حال میں اپنے کو ایاز ہی متعارف کراتی ہے اور تجاہل عارفانہ انداز میں بیزار ہو کر کہتی ہے۔

فقہ رہوں یہ نہیں عادت سوال جی نواب شکر یہ ظاہر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ انداز تکلم قبل اس کے بھی میری کانوں میں گونج چکا ہے اور یہ مصرع ادا کرتا ہے۔

ظالم تیری باتوں میں قیامت کا اثر ہے

نواب عالم اضطراری میں ایاز کو آغوش میں لے کر اس کے ہونٹ کو اپنے ہونٹ سے چومتا ہے اور یہ شعر کہتا ہے ۔

تمکنت یہ بھی کہے جاتے ہیں کوہ تمکین
ناز کی یہ ہے کہ غمزے بھی اٹھائے کوئی

اس طرح نواب اپنی محبت ایاز پر آشکارا کر دیتا ہے اور کہتا ہے میں کیسری سے نفرت کرتا ہوں اور کہتا ہے کہ جہانگیر نہیں تو نہیں مگر محمود زندہ ہے اس لیے تم مجھے چھوڑ کر یا بھول کر مت جاو گے اس جملہ پر آٹھواں باب مکمل ہوتا ہے۔نویں باب میں کیسری نواب کے گھر میں قدم رکھتے ہی نواب کو اپنے جوبن سے مسحور کر کے ہر چیز پر قبضہ کر لیتی ہے نواب کو باغ عیش میں عیش مناتے ہوئے تین دن ہوتے ہیں اس دن سے کیسری نے بھی عیش ونشاط کی محفل سجا رکھی ہے۔

کیسری نے سکندر خاں کے ساتھ عشق کا چکر چلا رکھا ہے۔جہاں نواب سیر سپاٹے کو گئے ادھر کیسری بھی سکندر کے ساتھ عشق کرنے لگی ایسے موقع سے کیسری کی آوارہ گردی کو آغا شاعر کے اس شعر کے ذریعہ بیان کیا ہے ۔

ہر روزِ عید ہے ہر شب شب برات
سوتا ہوں ہاتھ گردن مینا میں ڈال کر

حتی کہ دونوں شراب و کباب میں مست ہو کر بہک بہک کر باتیں کرتے ہیں اور سوسو طرح سے اپنی جوانی ایک دوسرے پر قربان کرتے میں۔ایک دوسرے سے جدا ہونے سے خوف زدہ ہو کر یہ شعر پڑھتے ہیں۔

ہے وصل میں بھی سحر کا کھٹکا لگا ہوا
جھونکے خزاں کے آتے ہیں فصل بہار میں

اور بڑی مایوسی سے کیسری نوجوان کو دیکھتی ہے کہ نواں بات احتتام کو پہونچتا ہے اور دسواں باب 'ایاز ہے تو جہاں ہے' کی صدا کے ساتھ نمو پذیر ہوتا ہے۔نواب صاحب ایاز کو حکم دیتے ہیں کہ کیسری کو بلائے (جب سلطانہ ایاز کے بھیس میں کیسری کو یہ خبر دیتی ہے تو دونوں میں نوک جھونک ہوتی ہے خیر کسی طرح کیسری نواب کی خدمت میں حاضر ہوتی ہے اور اپنی شوخی سے نواب کو مجبور کر کے ایاز کو نکال دینے کی التجا کرتی ہے نواب اس پر برہم ہوتا ہے اس سے کیسری سہم جاتی ہے مندرجہ شعر پر باب ختم ہوتا ہے۔

خا کساران جہاں رابحقارت منگر
تو جہ داتی کہ درمیں گرد سوارے باشد

گیارہویں باب کا آغا اس طرح ہوتا ہے کہ نواب جہانگیر ایاز اور وزیر نواب حبیب خاں سج دھج کر شاہانہ شان وشوکت کے ساتھ گھوڑے پر سوار شکار کو جاتے ہیں۔راستے میں ایاز اور نواب کے مابین بہت ساری باتیں ہوتی ہیں۔ایاز کیسری کی بے وفائی کا بھی ذکر کرتی ہے اس پر نواب کو بدگمانی ہوتی ہے البتہ شکار میں شیر کے خوفناک حملہ سے ایاز نواب کو بچالیتی ہے اور بہادری پر خوش ہو کر رباعی پڑھ کر داد تحسین دیتا ہے بارہویں باب کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ کیسری نے نواب کے ڈانٹنے پر رو رو کر اپنا خون کرلیا ہے۔نواب کو شکار میں گئے ہوئے تیسرا دن ہے ایک ضعیفہ نازل

ہوتی ہے اور کیسری کو بتاتی ہے کہ تمہارا پردہ فاش ہو گیا ہے۔ ایاز نے سارا قصہ نواب کو تمہاری بے وفائی کا بتا دیا ہے جس کی خبر حبیب خاں وزیر کو بھی ہو گئی ہے تیرہویں باب میں ایک اچکا لڑکا سکندر جاہ بیگ کی انگوٹھی فروخت کرنے جاتا ہے جو نواب کی انگلی سے نکال کر کیسری نے پہن رکھی تھی اس نے سکندر جاہ کو تحفہ میں دی تھی۔ بازار میں مول چند اور اس کی بیوی جئ دئی کے درمیان کافی تکرار ہوتی ہے۔ چودھویں باب میں سکندر جاہ یعنی کیسری کا عاشق ایک ضعیفہ کو اس بات پر معمور کرتا ہے کہ ایاز جہانگیر کا قتل کر دیا جائے۔ اس لیے ضعیفہ سکندر جاہ کے پاس جاتی ہے اور وہ ساری کہانی کہہ سناتی ہے کہ کسیری کا برا حال ہے اس لیے کہ ایاز نے تم دونوں کے عشق کا پردہ نواب کے سامنے فاش کر دیا ہے سکند جاہ ضعیفہ سے کہتا ہے کہ جاو کیسری کو تشفی دو۔ کھان کھلاؤ اور بے فکر رکھو جوگی بچہ یا نواب جہاں گیر کی اوقات ہی کیا ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں کیسری کا بال بانکا نہ ہوگا ضعیفہ کہتی ہے کہ مجھ سے کیسری نے یہ بھی کہا ہے کہ جب تک جہانگیر دار کو یا ایاز کو قتل نہ کرو گے تو میں زہر کھالوں گی۔ سکندر جاہ کہتا ہے تم جاو اور سکندر جاہ نے جہانگیر کے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔

پندرہویں باب میں جئ دئی ایک اوباش عورت ہے جو بنیا مول چند کی بیوی ہے سید خاں سپاہی یعنی حمید کا باپ جہانگیر دار کی نوکری کرتا ہے جو کیسری کا پہریدار ہے۔ رات کوئی ڈیڑھ بجے کا عمل ہے سید خان جمعراتی دروازہ کی طرف سے آواز لگاتے ہوئے معشوقہ سے ملنے جاتا ہے وہاں جئ دئی اور سید خان میں بات چیت پیار و محبت کی ہوتی ہے۔ جئ دئی وہی انگوٹھی دکھاتی ہے جس کو اس نے مسلمان چور اچکے سے خریدا ہے واپس گھر لوٹ کر انگوٹھی اپنی بیوی کو دیتا ہے مگر اس کی بیٹی حمیدن ضد کر کے ماں سے لے لیتی ہے اور عاشق اچھن کو تحفہ میں دے دیتی ہے جو نواب جہانگیر کا سپاہی ہے۔ سولہویں باب کا آغاز شام کا منظر چرند و پرند کا شور و غل کارخانوں کی آوازیں چمنی کا دھواں چھوٹے چھوٹے باغ کے مناظر سے ہوتا ہے یہاں نواب صدیق حسن خاں کا مقبرہ ہے اس وقت اس مقبرہ کے روبرو دو سوار آپس میں باتیں کرتے جا رہے ہیں یہ نواب جہانگیر اور ایاز کی گفتگو تھی۔ اچانک سکندر جاہ موقع پا کر حملہ کرتا ہے اور پہلے ہی وار میں جہانگیر دار گھائل ہو جاتا ہے

۔نواب کا یہ حال دیکھتے ہیں ایاز تاب نہیں لا سکا اپنا ریوالور نکال کر سکندر جاہ پر وار کرتا ہے جس سے اس کا بایاں ہاتھ اور گردن جسم سے الگ ہو جاتا ہے۔۔اس شعر پر سولہویں باب کا اختتام ہوتا ہے۔

جان پر کھیل کے عاشق کو بچا لیتے ہیں
تم نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت ولے

سترہویں باب میں تین دن سے پتلی گھر کے پاس ایک لاش پڑی ہے پولس والے تفتیش کر رہے ہیں مگر لاش کی شناخت نہیں کر سکے اس لیے کہ سر ہی غائب ہے جیب سے ایک کارڈ نکلتا ہے جس سے شناخت کیا گیا کہ سکندر جاہ ہے۔آخر اس کے بوڑھے ماموں نے اس کی تجہیز و تکفین کر دی اس کے بعد خفیہ پولس والے ان کے وراثوں سے مرحوم کے متعلق پوچھ تاچھ کرتے ہیں یہ بات غلام احمد یعنی سلطانہ بیگم کے چچا کو بھی معلوم ہوئی جو کافی پریشان ہوا کیونکہ وہ ابھی ابھی وارثوں کو صبر کی تلقین کر کے آئے ہیں اور اپنے کمرہ میں گئے یہ کہ کر کہ سلطانہ کو میرے پاس بھیج دو اتنے میں سلطانہ گلدستہ لیے شوخی کے ساتھ نازل ہوتی ہے اور مندرجہ ذیل شعر پڑھتی ہے۔

گل گلدستہ کر کے آئی ہے وہ صحن باغ سے
تفریح ٹپکی پڑتی ہے ان کے دماغ سے

غرض مسکراتی ہوئی چچا کے کمرہ میں جاتی ہے دونوں چچا بھتیجی میں بات چیت ہوتی ہے اور اس حال میں واپس ہوتی ہے اپنے کمرہ میں جا کر الماری سے ڈھکا ہوا ایک خوان اور ایک سربند خواچہ نکالتی ہے اور مسٹنڈی سیاہ فلم عورتوں کو لے کر لیسری کی خدمت میں بھیج دیتی ہے۔اور سلطانہ خوش وخرم دن گزارتی ہے اٹھارہویں باب میں نواب جہانگیر دار اپنے محل میں ہے اور ایاز کے فراق میں غمگین ہے ایاز اس وقت اس کی مصاحبت سے غائب ہو گیا جب سکندر جاہ کا قتل کر کے اس کا سر حاصل کر لیا اور نواب جہانگیر ہوش میں آیا تو وہ اکیلا تھا مگر اس کے سامنے اس کا دشمن گر کر تڑپ رہا تھا۔نواب موصوف کو اسی وقت اندازہ ہو گیا کہ ایاز نے ہی میری جان بچائی ہے سارے درباری نواب کی مزاج پرسی کرتے ہیں جن میں اچھن بھی ہے۔اچھن خیریت پوچھ کر نبض دیکھنے لگتا ہے

کہ نواب کی نگاہ انگوٹھی پر پڑ جاتی ہے اور پوچھنے لگتا ہے کہ اچھن یہ انگوٹھی تمہارے پاس کہاں سے آئی۔ یہ وہی اچھن ہے جس کا ذکر پہلے باب میں آچکا ہے جس پر سولہ سالہ لڑکی حمیدن قربان جاتی ہے اور شادی کے رسم ورواج سے گزر کر اچھن کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہے مگر اچھن جہانگیر دار کے یہاں ملازمت کرتا ہے جس کی وجہ سے آزاد کی زندگی گزارنا مشکل ہے۔ اچھن اور حمیدن کے تعلقات ناجائز ہیں مگر نکاح سے بے بہرہ اس طرح دیکھا جاتا ہے کہ سید خاں سپاہی سے مول چند کی بیوی اور سید خاں کی بیٹی حمیدن اچھن سے عشق فرماتی ہیں جن لوگوں کے دل میں عشق کا دریا طلاطم خیز ہے آغا شاعر کا یہی نکتہ ان کے ناولوں میں نفسیاتی اور رومانی ناول نگاری کا سراغ دیتا ہے۔

انیسویں باب میں نواب صاحب وہ انگوٹھی اچھن کے ہاتھ میں دیکھ کر آگ بگولہ ہو جاتے ہیں اور اچھن سے سوال کرتے ہیں کہ سچ بتا تو نے یہ انگوٹھی کہاں سے حاصل کی فوراً اس کو گمشدہ ایاز کا خیال آ گیا جس نے اس سے کہا تھا کہ آپ کو اپنی منکوحہ کی پاکدامنی پر کس درجہ یقین ہے۔ اب وہ سوچنے لگا کہ یہ انگوٹھی کیسری کو دی تھی اور اب یہ اچھن کے پاس ہے۔ قبل اس کے یہ بھی معلوم ہوا کہ کیسری بدچلن ہے بس کیا تھا نواب جلال میں آ گئے مگر حاضرین مجلس کا احترام کرتے ہوئے اچھن سے انگوٹھی کے بارے میں نرمی سے پوچھا اچھن نے شرماتے ہوئے کہا کہ یہ انگوٹھی میں نے سید خاں سپاہی کی بیٹی سے حاصل کی ہے اس کے بعد سید خاں کو بلایا جاتا ہے۔ دریافت کرنے پر وہ بتلاتا ہے کہ مجھے یہ انگوٹھی مول چند بنیا کی بیوی نے دی تھی یہ میری بیوی کے پاس تھی ہوسکتا ہے میری بیٹی نے ماں سے ضد کر کے لے لی ہو مگر پیر و مرشد آپ تک کیسے آئی پھر یاد آیا شاہ نے مول چند کے بارے میں معلوم کیا کہ بنیا کون ہے۔ سید خاں نے بتایا کہ مول چند ایک بنیا ہے جس کی بازار میں دکان ہے۔ نواب کے حکم سے دو سپاہی بنیا کو لے کر عالم پناہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بنیا بتاتا ہے کہ حضور ایک مسلمان چھوکرا جو مفلس تھا بیچنے کو آیا تھا میں نے خرید لی اس کے علاوہ انگوٹھی کی بابت میں اور کچھ نہیں جانتا۔

بیسویں باب میں نواب صاحب اپنے باغ میں بیٹھا انگوٹھی کے متعلق سوچتا ہے کہ ایک انگوٹھی کی وجہ سے کیسری کی بھی جان گئی اور سکندر جاہ کی بھی وہ غمگین ہو جاتا ہے اس عالم میں ان کا ملازم اسے ایک خوشنما لفافہ پیش کرتا ہے جسے کھول کر وہ پڑھنے لگتا ہے۔

اکیسویں باب میں نواب جہانگیر دار سلطانہ کا خط مزے لے لے کر پڑھ رہے ہیں جس کا پہلا جملہ ہی اس شعر سے شروع ہوتا ہے ۔

عید آتی ہے کہ آئی ہے گھڑی ہیرے کی
کیا گلے ملتی ہے اک ایک لڑی ہیر کی

جوگی بچہ کے بچھڑ جانے سے نواب جو خودکشی پر آمادہ تھا خوشی سے باغ باغ ہو گیا اور شاہانہ جوڑے میں ملبوس غلام احمد خان کے یہاں جلوہ افروز ہوا۔ جہاں ان کا شاندار استقبال ہوا اور سلطانہ نے پس پردہ کیسری اور سکندر جاہ کی موت کا ماجرہ سنایا بس اب کیا تھا نواب جو پہلے ہی سے سلطانہ بیگم کے حسن پر ہزار جان سے فریفتہ تھا مگر اس کی جرات و دلبری اور حیرت انگیز کارنامہ دیکھ کر غلامی لکھ دینے پر آمادہ ہو گیا اور فوراً شادی کی تیاری ہوئی اور شادی ہوگئی اور بھوپال میں یہ خبر پھیل گئی کہ نواب جہانگیر دار نے سلطانہ بیگم غلام احمد ان صاحب مقصد خاص کی ایک لائق و فائق تیر دل عدیم المثال بھتیجی سے شادی کر لی اس طرح اس شعر پر ناول کا اختتام ہو جاتا ہے ۔

بشر کو صبر نہیں ورنہ یہ مثال سچ ہے
کہ چپ کی داد غفور الرحیم دیتا ہے

جیسا کہ اس سے پہلے بھی ذکر آچکا ہے کہ 'ہیرے کی کنی' منصف کا طبع زاد ناول ہے جو حد درجہ رومانی ہے۔ ویسے اس ناول میں صنفی طور پر بہت سے کردار دیکھنے کو ملتے ہیں مگر خاص طور سے جہانگیر دار اور سلطانہ کا کردار اہم ہے اس میں سلطانہ بیگم کے کردار کو اولیت حاصل ہے۔ یہی دونوں کردار ناول کی روح ہے جو پورے ناول کے گرد طواف کرتے ہیں یہ ناول پورے اکیس باب پر مشتمل ہے ہر باب کا اختتام ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے اگر کوئی قاری چاہے کے چند

باب پڑھ کر کوئی فیصلہ صادر کرے تو یہ ممکن نہیں۔ ناول ہیرے کی کنی میں آغا شاعر نے تسلسل قائم رکھنے کے لیے اپنی غیر معمولی استعداد کا استعمال کیا ہے۔ اس ناول کے تنقیدی مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ حمیدن اچھن، جمئ دئی، مسیت خان، نواب جہانگیر دار سکندر جاہ سب کے سب عشق کے دلدادہ ہیں جو ہمہ وقت کسی نہ کسی صورت میں عشق کی آگ میں جل رہے ہیں مگر سب کا عشق چوری چوری ہے مکمل آزاد نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل میں مسلم گھرانوں میں بے پردگی نہیں تھی۔ آغا شاعر نے بیسویں صدی کی رسوم کو ملحوظ رکھا ہے اور اس زمانے کی زندگی کا ہر شعبہ سمٹ کر سامنے آجاتا ہے۔ جیسا کہ دوسرے باب میں نواب جہانگیر دار شادی کے لیے تیار ہے اور اس کی ماں خاندان کی وضع داری ختم ہونے کے خوف سے منع کرتی ہے مگر نااہل بیٹے کی کرتوٹ پر مجبور ہو کر ماں کیسری کو گھر لاتی ہے۔ یہاں جذبات کو خاص دخل ہے کہ ایک ماں بیٹے کو ہر حال میں قبول کرتی ہے۔ جہاں ذات کے مسئلے پر وزیروں میں چہ مگوئیاں ہوتی ہیں کہ ایک مسلم نواب ہندو لڑکی سے شادی کرتا ہے اس سے سیاست کا خوفناک نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ کہ غریب پربھو مالی کی زبان بند ہے اور وہ اپنی لڑکی کا ڈولا نواب کے یہاں پہنچا دیتا ہے۔ تیسرے باب میں آغا شاعر نے امیر زادی کی مجلس ناچ گانے اور عیش کے لوازمات کو پیش کیا ہے اور بھوپال کی مجلس عاملہ کی منظر کشی چابک دستی سے کی ہے جس سے ان کی فن پر دسترس کا ثبوت ملتا ہے۔ منظر نگاری میں موصوف کو قدرت ہے چاہے کسی جگہ کی ہو اس کو پر اثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ جب ہم ان کی ناول کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی منظر نگاری آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول میں منظر نگاری کر کے آغا شاعر نے منظر نگاری کے باب کا دروازہ کھول دیا ہے اور مکالمہ نگاری کے موتی پرو دیئے ہیں اس ناول کے تنقیدی مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ نواب صاحب کے گھر کیسری ایک رکھیل کے طور پر رہی ہے اس لیے ناول میں کہیں بھی کلمہ اور عقد پڑھانے کا ذکر نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ نواب صاحب کی ماں نے رسم کے مطابق کیسری کو اٹھا کر دیوان خانہ میں پہونچا دیا اس سے شادی ہونا قطعی ظاہر نہیں ہوتا ہے اس

ناول میں بنیا وغیرہ کا کردار صرف ناول کو طول دیتے ہیں اور قصہ کو دلچسپ بنانے کے لیے پیش کیا ہے۔ غلام محمد خاں کا کردار صاف اور سادہ نظر آ رہا ہے۔ جیسا کہ اس نے سلطانہ کو نواب کے گھر نوکری دلا کر سلطانہ بیگم کی مدد کی۔ اس ناول میں آغا شاعر نے خاص طور سے طبقہ اعلیٰ کہ معاشقہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ شرفاً کو گھر میں بھی رنڈیاں ناچتی ہیں جو اپنے آپ کو عزت دار جانتے ہیں مگر انہیں شرفا میں سلطانہ بیگم ایک مرحوم نواب کی اکلوتی بیٹی ہے۔ ناول میں اس کا کردار سب سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے جس کا ذکر اس سے قبل بھی آ چکا ہے۔ عزت و شرافت کے ساتھ اس کے دل میں شادی کا جذبہ موجزن ہے جس کی بدولت وہ مختلف قسم کی اذیت اٹھاتی ہے۔ ناول 'ہیرے کی کنی' کا پورا پلاٹ اسی کے ارد گرد گھومتا ہے اس کے برعکس نواب کا کردار ارتقائی ہے انہوں نے عالم شباب میں نگاہ عشق کا شکار ہو کر ایک مالن کو اپنا تو لیا مگر بعد میں بھید کھلا تو اپنے فیصلے پر کرافسوس بھی کیا اور جب عشق کا نشہ زائل ہوا تو اپنی خاندانی شرفت یاد آنے لگی اور آخر میں نواب کیسری سے کنارہ کش ہو کر جوگی بچہ ایاز یعنی سلطانہ بیگم کی طرف رجوع ہوئے۔

آغا شاعر کچھ اس انداز سے اپنے کرداروں کو ابھارتے ہیں کہ ناول 'ہیرے کی کنی' شروع ہوتا ہے لفظ 'میں' سے یہ ایک کنواری لڑکی کا 'میں' ہے اس کے شعور کی رو سے اس کا کردار اس طرح جلوہ گر ہوتا ہے۔

> 'میں یہ میٹھی ٹکیا جو اماں نے بڑی چاو سے پکائی ہے، کھا تو رہی ہوں لیکن رہ رہ کر تم یاد آ رہے ہو قسم ہے نوالہ حلق سے نہیں اترتا۔ حیران ہوں کہ ان کی بے چینیوں کا ایک دن کا کیا نتیجہ نکلے گا اچھا میں کہتی ہوں کنوار پنا تو ساری دنیا کا ہوتا آیا ہے یہ خدائی مار ہمارا کنوار پنا کون ناری کا حسن چلا ہے کہ ایک گھڑی نگوری چین سے نہیں کٹتی۔ تو یہ ہے اماں باوا آپ تو چین کرتے ہیں لیکن ہمیں یوں ہی پچھتاوا

کر کے بٹھا رکھا ہے کہیں کوئی بات ہی نہیں سمجھ میں آتی ۔

14

وہیں آغا شاعر ایک دوسری لڑکی کے کردار کو اس طرح بیان کرتے ہیں ۔

'شاید وہ لڑکی ایسی ہی قبول صورت ہو جس پر ایک دیکھنے
والے کی نگاہیں قربان ہو جاتی ہوں پھر تو تعجب نہیں ہے اگر
نواب اس پر جان دیتا ہے لیکن ہائے امید میں کہتی ہوں ہر
شخص تو قربان ہو جائے جوتی کی نوک سے ہو جائے نواب
جہانگیر جیسا بھی تو حسن مجسم ہے خود پھر اس کی بلا کو کیا غرض
پڑی تھی جو اس رذیل قوم سے آنکھیں لڑائی توبہ ہے ۔'

15ح

اس طرح آغا شاعر کا ناول 'ہیرے کی کنی' نہایت دلفریب ہے مکالمے فطری برامحل اور برجستہ ہیں ناول میں ڈرامائی انداز نمایاں ہے ۔

'ناہید' بھی آغا شاعر کا اہم ناول ہے جو دو پلاٹوں پر مشتمل ہے ۔ پہلے پلاٹ میں ناہید اور جہاندار کے عاشقی کا احوال ہے اور دوسرے پلاٹ جہاندار کی خواہر اور 'ناہید' کے بھائی منجھو صاحب کے پیار و محبت کا ذکر خیر ہے دونوں دو الگ الگ خاندان کے افراد ہیں ۔ دونوں خاندانوں میں کشمکش صدیوں سے اس دور کی روایت کے مطابق چلی آ رہی ہے ٹھیک اس طرح جس طرح 'ارمان' میں ایک ہی خاندان کی خانگی معاشرت کی وجہ سے المناک نتائج وجود میں آتے ہیں اس کے برعکس 'ناہید' میں دو خاندانوں کے مابین دشمنی کی چنگاری ایک مدت سے بھڑکتی ہے وہ اچانک بہت ہی خوش آئیند اور عمدہ تعلقات میں بدل جاتی ہے قصہ کچھ اس طرح کا ہے کہ ناہید کے گھر آگ لگ جاتی ہے جہاندار ایسے موقع سے بعض و نفرت کو بالائے طاق رکھ کر بہادری اور دلیری سے 'ناہید' کو بچا لیتا ہے اور اس کی صحت یابی کے لیے اپنی ہمشیرہ اختر کے ساتھ زنانہ لباس ذیب تن کر

کے سوسوطرح سے ناہید کی تیمارداری کرتا ہے۔ جہاندار ناہید سے محبت کا دم بھرنے لگتا ہے اور ناہید بھی اس کے لیے کمر بستہ ہو جاتی ہے ۔یعنی جہاندار اور ناہید ایک دوسرے کی محبت کے اسیر ہوجاتے ہیں جب دونوں کا راز کھلتا ہے تو ناہید کے والدین اس کو قید میں ڈال دیتے ہیں ہزار ہا پابندیاں عاید کردی جاتی ہیں کہ جہاندار سے ملاقات نہ کرے اور نہ اس کا نام لے مگر جب جہاندار کو اس کی خبر ملتی ہے تو وہ ناہید کو اس دوزخ سے آزاد کرانے کی ترکیب سوچتا ہے۔ چونکہ جہاندار کے لیے ناہید سادہ لوح معشوقہ ہے جس کو وہ کھونا نہیں چاہتا اس سے جہاندار کو سچی محبت ہے۔ بہرحال جہاندار کی فریاد باران سے رحمت جوش میں آتی ہے اور ایک دن جہاندار ناہید کو اس کے والدین کے شکنجے سے نکالنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور دونوں ہم آغوش ہوکر خوب رو رو کر جی ہلکا کرتے ہیں اور اسلامی شرع کے مطابق دونوں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہوجاتے ہیں یعنی شادی ہوجاتی ہے مگر کچھ دنوں تک دونوں کو جلا وطن رہنا پڑتا ہے ان دنوں جہاندار ناہید بنارس کانپور، اٹاوہ، آگرہ، دہلی وغیرہ کا طواف کرتے رہتے ہیں۔ان کی اس حرکت کو کچھ لوگ غلط تصور کرتے ہیں مگر نہیں ایسے وقت میں ان کے لیے ایسا کرنا موزوں تھا اس لیے کہ ان دو خاندان میں نفرت و دشمنی کی آگ ایک عرصہ سے بھڑک رہی ہو وہاں معاشرے کے ذریعہ شادی ہوجائے تو یقینی بات ہے کہ تنازعہ اور بڑھے گا اس لحاظ سے جہاندار نے اچھا کیا کہ شادی کے فوراً بعد ناہید کو لے کر شہر سے دور چلا گیا اور خون خرابہ سے دونوں خاندان بچ گئے اور جب دونوں کے والدین مطمئن ہوگئے تو دونوں نے مستقل سکونت اختیار کرلی دوسرا پلاٹ بھی کچھ اسی طرح کا ہے کہ ادھر جہاندار کی بہن ناہید کے بھائی منجھو پر عاشق ہوجاتی ہے جہاندار اور ناہید کی بہ نسبت ان دونوں کی عاشقی دھیرے دھیرے پروان چڑھتی ہے۔متعدد بار دونوں ملاقاتیں کرتے ہیں۔اتنی عروج پر محبت جلی جاتی ہے گویا دو جسم ایک قالب ہوں۔ابھی تک دونوں چوری چوری ملاقاتیں کرتے ہیں اچانک منجھو شدید طور پر بیمار ہوجاتا ہے اس کی خبر اختر کو ہوتی ہے مگر وہ کیا کرسکتی ہے وہ تو مجبور ہے اس لیے کہ وہ لڑکی ہے اور والدین کی اجازت کے بغیر نہیں جاسکتی ہے پھر خاندانی شرافت بھی مانع

ہے اس کے بھائی کے کارنامے سے اس کی خاندان کی شرافت پر آنچ آ چکی تھی وہ مزید اس آنچ کو بھڑکانا نہیں چاہتی تھی آخر اس کی عقل میں بھی یہی بات آئی کہ وہ بھی اپنے بھائی کی طرح مردانہ لباس میں ملبوس ہو کر اختر کی تیمارداری کو جا سکتی ہے اور وہاں پہنچ کر فہیم اختر کی تیمارداری کرتی ہے منجھو جو بیماری سے گھبرا کر زندگی سے عاجز آ چکا ہے خودکشی کے درپے ہو چکا تھا اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے منجھو نے ایک دن زہر پینا چاہا مگر اختر اپنی دوراندیشی اور حکمت سے منجھو کو زہر پینے سے باز رکھتی ہے اور منجھو کو اختر کی بے پناہ محبت کا احساس ہوتا ہے اور وہ سو سو بار ہمدردی اور محبت سے اس پر قربان جاتا ہے اور زمانے سے جو خاندانی مخاصمت چلی آ رہی تھی اس کو آن کی آن میں محبت اخوت و یکجہتی میں تبدیل کر کے نفرت کی دیوار گرا دیتا ہے اس کے بعد اختر کی شادی منجھو اور ناہید کی شادی جہاندار سے ہو جاتی ہے۔ اس ناول میں بھی آغا شاعر نے ہیرے کی کنی کی طرح اعلیٰ طبقہ کی سیرت پیش کی ہیں۔ جیسا کہ ناول ناہید میں اختر منجھو کی عاشق ایک ملازم کی طرح مردانہ لباس میں تیمارداری کرتی ہے یہ مقام بالکل ایسا ہی ہے جیسا 'ہیرے کی کنی' میں سلطانہ بیگم جوگی بچہ ایاز بن کر نواب جہانگیر احمد کی مصاحبت میں رہتی ہے ناول ناہید کا کوئی ایک کردار بھی ایسا نہیں جو دیرپا ہو یا دلچسپ ہو یہ بحث اور ہے مگر جب تنقیدی نقطہ نگاہ سے غور کیا جائے تو پہلے پلاٹ میں جہاندار اور دوسرے پلاٹ میں اختر کا کردار نمایاں اور خاص اہمیت کا حامل ہے۔

آغا شاعر کا یہ ناول ان کی فنون لطیفہ سے دلچسپی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ دراصل یہ ناول یوپی کے تعلقہ دار خاندان کی تاریخ ہے جس میں اس عہد کی معاشرت تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے اس معاشرت پر جہالت کے ساتھ ساتھ جذبات کا رنگ بہت گہرا ہے یہاں تک کہ خاندان کے افراد کے سوچنے کا طریقہ جاہلانا ہے جس میں جذبات کو خاص دخل ہے اس کی مثال ہے کہ آن کی آن میں دشمنی کی دیوار مسمار ہو کر محبت اور رفاقت میں بدل جاتی ہے ناول میں مکالمہ نگاری اور منظر نگاری خاص درجہ رکھتی ہے کسی بھی ناول کی جانچ پرکھ مجموعی طور پر کی جاتی ہے۔ ح16۔ اس اعتبار سے بھی 'ناہید' ایک اچھا ناول ہے جس میں ابتدا سے انتہا تک قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ اس

بات کو سہیل بخاری نے مصنف کے کمال سے تعبیر کیا ہے۔17۔اور وارن بیچ نے کہا ہے کہ ہرا چھے ساخت کا ناول اچھا نہیں ہوتا ہے۔ح۔18۔اور مام روسو کی کو اچھا ناول نگار کہہ کر خراب فنکا رٹھہراتا ہے۔ح19 ان تمام ناقدوں نے ناول کے بارے میں جو خیالات پیش کیے ہیں اس کی روشنی میں آغا شاعر کا ناول ناہید ایک ناول ہے اس میں ایک اچھے ناول کے ساتھ ناول کے سارے عناصر موجود ہیں۔عشق ومحبت تجسس، سنسنی خیزی سراغ رسانی پھر ہیرو، ہیروئین کا ملاپ جیسا کہ ناول کے موضوع سے ہی پتہ چلتا ہے کہ 'ناہید' ناول کا اہم کردار ہے جو صورت وسیرت میں کامل ہے۔

ایک اچھا ناول نگار داخلی اور خارجی کائنات پر غور کرتا ہے وہ کائینات کہ مدعا کو موضوع بنا کر پیش کرتا ہے جو کہ عام انسانی زندگی کے لیے کارآمد ثابت ہو۔بیسویں صدی کے اوائل میں جہاں لاتعداد ناول نگاروں نے مروجہ روایات اور نقطہ نظر کے تحت ناول نگاری میں اپنی شناخت بنائی۔ وہیں آغا شاعر دہلوی نے اپنے چار اہم ناول ارمان ہیرے کی کنی، ناہید اور نقلی تاجدار لکھے اور اردو ناول نگاری میں رومان نفسیات اور سماجیات کو شامل کیا یہ الگ بحث ہے کہ وہ دوسرے درجہ کے ناول نگار ہیں اس سے مجھے اختلاف نہیں لیکن درجہ دوم کے ادیبوں کے بغیر درجہ اول کے مصنفوں کی کوششوں کو سراہنا بھی مشکل کام ہے یوسف سرمست کا خیال ہے کہ آغا شاعر کے ناول ناہید کو اردو کے قدیم ناول نگاری میں جو مقام ملنا تھا وہ تو درکنار غور طلب بات یہ ہے کہ ناقدین اس ناول کا موہوم سا اشارہ بھی ناول پر لکھے جانے والے مضامین میں نہیں کرنے جبکہ ان کے ناول اردو ناول نگاری میں اضافہ کرتے ہیں۔آغا شاعر کے بیشتر ناولوں میں نوجوانوں کی جذباتی اور ذہنی زندگی کی کشمکش کو اپنے ناول کا موضوع بنایا گیا ہے۔ناول کی شان وشوکت اس کی ہیروئن کی نفسیاتی اور ذہنی کیفیات کے اظہار سے تیار کیا گیا ہے۔ناہید کی زندگی کہ نفسیات کو قلم بند کرتے ہوئے آغا شاعر نے جدید نفسیاتی علم کا سہارا لیا اور اس کی روشنی میں اس کے کردار کی تحلیل نفسی کی ہے۔

یہ ناول آغا شاعر کی ناول نگاری کی صلاحیت پر روشنی ڈالتا ہے اور بیسویں صدی کے ناول

نگاری کے ان تمام رجحانات کو سامنے لاتا ہے جس کا تذکرہ پچھلے صفحات میں تفصیل سے ہو چکا ہے۔آغا شاعر کے اس ناول کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ پوری سنجیدگی سے اس طرف متوجہ ہوتے تو یقیناً اردو ناول نگاری میں بہترین اضافہ کرتے پھر ان کے یہ چند ناول اردو ناول نگاری میں اہمیت رکھتے ہیں۔

انہوں نے اپنے ناول 'ناہید' میں ایک ایک کردار کو نمایاں کرنے میں جس تحلیل نفسی سے کام لیا ہے وہ ان کے اس ناول کو بڑی اہمیت بخشتی ہے۔جیسا کہ ناقدوں کی رائے ہے کہ ایک اچھا ناول لکھنے والا تخلیقی واقعات میں مواقع پیدا کر کے ایک بصیرت پیدا کرتا ہے۔یہی بصیرت آغا شاعر کے ناولوں میں ملتی ہے۔البتہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آغا شاعر کے ناول کے بغیر بیسویں صدی کی ناول کو سمجھنا مشکل ہوگا۔

آغا شاعر نے اپنے ناول میں انسان کے نفسیاتی اور سماجی پہلو کو جس انداز سے بیان کیا ہے اس سے اردو ادب کے کسی بھی نقاد کو اختلاف نہیں ہوسکتا اب یہاں تجزیہ کرنا ہے کہ کیا وہ اپنے آپ میں ایک کامل ناول نگار ہو سکتے ہیں کہ نہیں یہ ایک الگ بحث ہے۔لیکن یہ امر مسلم ہے کہ کسی بھی ناول کے لیے ایسے موضوع کا ہونا ضروری ہے کہ جو کسی بھی سماج معاشرہ اور حکومت کی صحیح تصویر پیش کر سکے جس میں ناول نگار کا مزاج، خیالات، نقطہ نظر پنہاں اور اس کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔ ہر قاری یا ناقد کسی بھی تخلیقی ورثہ کو اپنے نقطۂ نگاہ سے جانچ پرکھ کر کے اس کی کامیابی کا حکم صادر کرتا ہے۔آغا شاعر کے ناولوں میں کامیابی کے سبھی عناصر موجود ہیں اور اس بنیاد پر یہ رائے پیش کی جاسکتی ہے کہ آغا شاعر اپنے موضوع اور مزاج کے اعتبار سے صف دوم کے ناول نگاروں میں اہمیت رکھتے ہیں۔انہوں نے اپنے ناول کے موضوعات عام انسانی زندگی سے لیے ہیں اس لیے ان میں قاری کے لیے دلچسپی بھی ہے اور تجسس بھی۔آغا شاعر نے اپنے ناولوں میں فنی اصول کا خاص خیال رکھا ہے اردو ادب کے ناقدوں اور ادیبوں کی رائے حق بہ جانب ہے کہ ایک اچھا ناول نگار ناول تخلیق کرتے وقت فنی اصول کا بہت خیال رکھتا ہے اور ہر ناول نگار فنی آہنگ کو اپنے

ناولوں میں اپنے اپنے طور پر مختلف طریقے سے نبھاتے ہیں۔اس اعتبار سے آغا شاعر اپنے آپ میں مکمل ہیں لیکن یہ بھی تلخ حقیقت ہے کہ آغا شاعر نے اپنے ناولوں میں فن کاری کا بہت زیادہ خیال نہیں رکھا ہے۔

حوالے:

1۔ادب کا تنقیدی مطالعہ ڈاکٹر سلام سندیلوی

2۔تنقیدی اشارے۔آل احمد سرور

3۔آج کل نئی دہلی اکتوبر 1986ء

4۔تھیوری آف لٹریچر صفحہ 101

5۔تھیوری آف لٹریچر صفحہ 251

6۔کورست 'کوارٹرلی' اپریل، جون 1959ء

7۔کالیکٹیٹ پیپرز دولیم فورتھ صفحہ 9

8۔کالیکٹیٹ پیپرز دولیم فورتھ صفحہ 92

9۔کالیکٹیٹ پیپرز دولیم فورتھ صفحہ 96

10۔کالیکٹیٹ پیپرز دولیم فورتھ صفحہ 95

11۔کالیکٹیٹ پیپرز دولیم فورتھ صفحہ 102

12۔کانٹری بیوشن ٹو انلاسیکل سائکولوجی صفحہ 199

13۔کانٹری بیوشن ٹو انلاسیکل سائکولوجی صفحہ 191

14۔اردو ناول نگاری صفحہ 116-115

15۔ہیرے کی کنی صفحہ 1

16۔ہیرے کی کنی 'آغا شاعر صفحہ

17۔فکشن اینڈ پبلک صفحہ 213

18۔اردو ناول نگاری سہیل بخاری صفحہ 118

19۔دی ناول ان دی سینٹوری صفحہ 121

20۔گریٹ ناولسٹ اینڈ اولس صفحہ 202

کتابیات

کتابیات

1- آغا شاعر حیات وشاعری	مرتبہ مجتبیٰ حسین خاں	لاہور	1970ء
2-اردو ناط کی تاریخ	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	لکھنؤ	1962ء
3-انگریزی عہد میں ہندوستان	عبداللہ یوسف علی	الہ آباد	1936ء
4-اردو ادب میں رومانی تحریک	ڈاکٹر محمد حسن	لکھنؤ	1950ء
5-اردو ادب جنگ عظیم کے بعد	ڈاکٹر سید عبداللہ	لاہور	1941ء
6-ادب کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر سلام سندیلوی	لکھنؤ	1986ء
7-اردو ناول نگاری	سہیل بخاری	دہلی	1972ء
8-اردو نثر کی داستانیں	گیان چند جین	کراچی	1945ء
9-اردو زبان اور فنی داستان گوئی	کلیم الدین احمد	پٹنہ	
10-اردو کا افسانوی ادب	بہار اردو اکیڈمی	پٹنہ	1987ء
11-اردو ناول سمت ورافتار	سید حیدر علی	الہ آباد	1977ء
12-ارمان	آغا شاعر قزلباش	دہلی	1903ء
13-امراؤ جان ادا	مرزا ہادی رسوا	دہلی	1958ء
14-ایام عرب	عبدالحلیم سرر	لکھنؤ	1915ء
15-ایامی	ڈپٹی نظیر احمد	دہلی	1991ء
16-ابن الوقت ۔مرتبہ سید	ڈپٹی نظیر احمد	لاہور	1961ء
17-بہار کا اردو ادب	ڈاکٹر ارتضیٰ کریم	دہلی	1986ء
18-بیسویں صدی میں اردو ناول	یوسف سرمست	حیدر آباد	1973ء
19-پریم چند شخصیت اور کارنامے	پروفیسر قمر رئیس	دہلی	1987ء

20-ترقی پسند ادب بچاس سالہ سفر	پروفیسر قمر رئیس	دہلی	1987ء
21-تنقیدی اشارہ	آل احمد سرور	علی گڑھ	1942ء
22-ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	علی گڑھ	1945ء
23-حمکدہ خیلم	کتب پرنٹرز اینڈ پبلیسرز، کراچی		1976ء
24-خدائی فوجدار	رتن ناتھ شرسار	لکھنؤ	1903ء
25-داستان سے افسانے تک	وقار عظیم	لاہور	1960ء
26-ذات شریف	مرزا ہادی رسوا	لکھنؤ	1921ء
27-اوبائے صادق	ڈپٹی نذیر احمد	دہلی	1899ء
28-سرشار کی ناول نگاری	ڈاکٹر سید لطیف حسین	کراچی	1961ء
29-سونیئر	آغا شاعر	دہلی	1983ء
30-صبح گلشن	مطبوعہ شاہ جہانی	بھوپال	
31-عبدالحلیم شرر سحمہ یتاروفن	ڈاکٹر شریف احمد	دہلی	1989ء
32-عجائبا لقصص تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر ارتضیٰ کریم	دہلی	1987ء
33-فسانہ آزاد	رتن ناتھ سرشار	لکھنؤ	1935ء
34-مقدمہ شعروشاعری	الطاف حسین حالی	لاہور	1945ء
35-میدان عمل	منشی چند	دہلی	1952ء
36-مراۃ العروس	ڈپٹی نذیر احمد	کانپور	1886ء
37-محمد علی طیب حیات اور تعانیت	ڈاکٹر عبدالحی	دہلی	1989ء
38-ناہید	آغا قزلباش	دہلی	1903ء
39-ہندوستان کا اردو ادب	ڈاکٹر محمد ذاکر	دہلی	1981ء
40-ہیرے کی کنی	آغا شاعر قزلباش	دہلی	1903ء

41- قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ	ڈاکٹر ارتضیٰ کریم	دہلی
42- انتظار حسین ایک دبستان	ڈاکٹر ارتضیٰ کریم	دہلی

'رسائل و جرائد'

'چمنستان'	1940ء	دہلی
'نقد و نظر'	1942ء	آگرہ
'منادی'	1942ء	دہلی
'سیپ'	1964ء	کراچی
'آج کل'	1947ء	دہلی
'انجام'	1964ء	کراچی
'شعلہ و شبنم'	1952ء	دہلی
'گوشت' کواٹرلی	1959ء	بمبئی

BIBILOGRAPHY OF ENGLISH BOOK

1. Aspect If the Novel - E.M. Forster - 1962 - London.
2. The Art of Novel - Pelhan Edgar - 1933 - New York
3. The Advance of the English Novel - W. Lyon Philips -1916- NY
4. The Living Novel - Pritchett - 1954 - London
5. Munshi Prem Chanda - Madan Gopal - 1964 - Delhi
6. Modern Novel - Walter Allem - 1964 - New York
7. Collection Papers Vol - IV - Sigmond Frend - 1948 - London
8. Contribution to Analytical Psychology - C.G. Jung, Trasnlated by H.G. and Carry F. Baynes
9. The Novel in the Twelth Century- Joseph Warren -1932 NY
10. Theory fo Literature - Warren
11. Piction and reading Public
12. Great Novelist and their Novel's
13. Novelist on the Novel - Ed Miriam Allett - 1954 - London
14. The Novel Today - Philip Hinderson - 1936 - London
15. The Rise of the Novel - I am watt - 1957 - London
16. Reading a Novel - Walter Allen -1956 - London
17. The English Novel - I.B. Priestly - 1905 London
18. The Novel and the people - Rolf Fox -1956 - Moscow
19. The story of a Novel - - Thoms Wolf - 1936 - New York
20. The technique of the Novel - Thomars H. Uzzel -1948 U.S.A

Agha Shair Ki Novel Nigari

Dr. Md. Yahya Saba

Published By:

MAAZ PUBLICATIONS

H.No.117, S. No.170, Zaitoon Pura,
Malegaon Nasik, Maharashtra, India, 423203

9 788193 047712